الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

انا کو چھیڑنے سے پہلے ہر آدمی آپ کا دوست ہے
انا کو چھیڑنے کے بعد ہر آدمی آپ کا دشمن

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

اکتوبر ۱۹۹۲ شمارہ ۱۹۱

الرسالہ بک سنٹر

اردو، ہندی، انگریزی اور عربی میں ملک اور بیرونِ ملک
کی چھپی ہوئی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کا عظیم مرکز

- قرآن • حدیث • تفسیر • سیرت وسوانح • فقہ وقانون
- عقائد • دعوت وتبلیغ • تاریخ • اسلامی تحریک • اخلاقیات
- خواتین اور بچوں کے لیے دینی اور اصلاحی کتابیں • ڈکشنریاں اور علمی مراجع
- پاکستان کی چھپی ہوئی علمی، ادبی اور دینی کتابیں • سیاست
- قاہرہ اور بیروت کی چھپی ہوئی عربی کتابیں • اسلامی معاشیات
- اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر معیاری کتابیں • ثقافت اور تعلیم
- اسلامی مجلات ورسائل • دیگر ادیان ومذاہب کی بنیادی کتابیں
- زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ انسانیت سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ کتابیں
- اسلامی موضوعات پر آڈیو اور ویڈیو کیسٹ • طغرے اور عید کارڈ وغیرہ

نمبر ۱ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

فون: ۶۹۷۳۳۳، ۶۱۱۱۲۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۲ نمبر ۱۹۱

دعا اور اعتراف	۴	موت کا نشانہ	۱۵
نیا دور	۵	سبق آموز	۱۶
درست مشورہ	۶	تاریخ کا صفحہ	۱۸
برترحل	۷	عبرت ناک	۲۰
شکر نہیں	۸	حفاظتی ڈھال	۲۲
دعوت کا اصول	۹	دو طریقے	۲۷
عقل کی بات	۱۰	تشخص کا مسئلہ	۲۸
قدیم و جدید	۱۱	سفر مالٹا۔۳	۳۰
اعتراف	۱۲	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۶
بہتر حکومت	۱۳	ایجنسی الرسالہ	۴۹
احساس اصلاح	۱۴	ایک ملی ضرورت	۵۰

AL-RISALA (URDU) Monthly
The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013
Telephone: 611128, 697333; Fax: 91-11-3312601 (Attn: Tel. 697333)
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US$25 (Air Mail)

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

دعا اور اعتراف

تاریخ اسلام کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو مواخاۃ کہا جاتا ہے۔ مکہ کے مسلمان جب مہاجر کی حیثیت سے مدینہ میں آئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ دو دو شخص اللہ کی راہ میں بھائی بھائی بن جاؤ (تآخوا فی اللہ اخوین اخوین) اس ہدایت کے مطابق ہر انصاری نے ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنالیا۔ انصار نے اپنے تمام اثاثہ کو تقسیم کرکے آدھا خود لیا اور آدھا اپنے مہاجر بھائی کو دیدیا۔ اس مواخاۃ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس معاملہ میں انصار نے یک طرفہ طور پر جس کمالِ ایثار کا ثبوت دیا اس کی کوئی دوسری مثال پوری معلوم تاریخ میں نہیں ملتی۔ انصار کے اعلیٰ سلوک سے خود مہاجرین بے حد متاثر تھے:

قال الامام احمد: حدثنا یزید، اخبرنا حمید، عن انس، قال: قال المهاجرون: یا رسول اللہ ما رأینا مثل قوم قدمنا علیهم احسن مواساة فی قلیل، ولا احسن بذلا من کثیر، لقد کفونا المؤونة واشرکونا فی المهنا، حتی لقد خشینا ان یذهبوا بالاجر کله قال: "لا، ما اثنیتم علیهم ودعوتم اللہ لهم"

حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین نے کہا کہ اے خدا کے رسول، جس قوم کے یہاں ہم آئے ہیں، ان سے بہتر قوم ہم نے نہیں دیکھی۔ وہ کم میں بہترین ہمدردی کرنے والے ہیں اور زیادہ میں بہترین خرچ کرنے والے ہیں۔ وہ محنت میں ہماری طرف سے کافی ہوگئے اور پیداوار میں ہم کو شریک کرلیا۔ حتیٰ کہ ہم کو ڈر ہے کہ سارا اجر انھیں کو نہ مل جائے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرو اور اللہ سے ان کے لیے دعا کرتے رہو (سیرۃ ابن کثیر ۲/۳۲۸)

اس حدیث سے نہایت اہم اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ زید کو بکر سے کچھ ملے مگر زید کے پاس کوئی مادی چیز لوٹانے کے لیے نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ ایسی حالت میں زید کو چاہیے کہ وہ بکر کے عطیہ کا کھلے دل سے اعتراف کرے۔ اعتراف کا یہ احساس اتنا زیادہ گہرا ہو کہ زید کے دل سے بکر کے لیے دعائیں نکلنے لگیں ——— مال والے کے پاس دینے کے لیے اگر مال ہے، تو بے مال والے کے پاس بھی دینے کے لیے ایک چیز موجود ہے، اور وہ دعا اور اعتراف ہے۔ اور بلاشبہ دعا اور اعتراف کی اہمیت کسی مادی عطیہ سے کم نہیں

نیا دور

زمین پوری کائنات میں ایک استثنار ہے۔ یہاں کے وسائل اور یہاں کے امکانات بے پناہ ہیں۔ وہ حسن اور معنویت کی ایک پوری دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں وہ سب کچھ اعلیٰ ترین مقدار میں موجود ہے جس کے ذریعہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ابدی تہذیب بنائی جا سکے۔

اس زمین کو سب سے پہلے اس مخلوق کی تحویل میں دیا گیا تھا جس کو جن کہا جاتا ہے۔ مگر وہ اس عطیہ کے اہل ثابت نہ ہو سکے۔ روایات میں آیا ہے :

عَن ابنِ عباس قال إنّ اولَ مَن سَكَنَ الارضَ الجن فأفسدوا فيها وسفكوا فيهَا الدمَاء وَقَتَلَ بعضُهم بعضًا — ثُم خَلَقَ اللهُ آدمَ فاسْكَنهُ ايّاها فلذٰلك قالَ (إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً) تفسیر ابن کثیر ۱/۷۰

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ زمین پر سب سے پہلے جنات بسائے گئے۔ انھوں نے زمین میں فساد برپا کیا اور خون بہایا اور ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر بسایا۔ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسانوں میں کچھ افراد اس آبادکاری کے اہل نکلے۔ مگر انسانوں کی اکثریت اس معاملہ میں نااہل ثابت ہوئی۔ موجودہ زمانہ میں یہ نااہلی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ آج پوری دنیا انسانوں کے ظلم اور فساد سے بھر گئی ہے۔ ہر طرف لوٹ اور قتل کے ہنگامے جاری ہیں۔

یہ صورت حال اشارہ کر رہی ہے کہ غالباً اب زمین پر وہ آخری تبدیلی آنے والی ہے جس کی بابت بائبل میں یہ الفاظ آئے ہیں : صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے (زبور باب ۳۷) قرآن میں اس کا اعلان ان لفظوں میں کیا گیا ہے : اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ بے شک اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے (الانبیاء ۱۰۵ - ۱۰۶)

خدا کا یہ آخری فیصلہ اس طرح ظاہر ہوگا کہ تمام برے لوگ کاٹ کر پھینک دیے جائیں گے اور عابد اور صالح افراد ابدی طور پر زمین کے مالک ہوں گے۔

درست مشورہ

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے ۱۵ ویں یوم آزادی کی تقریر میں ایک اہم بات کہی۔ اکثر اخباروں نے اسی کو اپنی سرخیوں میں نمایاں کیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۶ اگست ۱۹۹۲) نے اس تقریر کی جو رپورٹ چھاپی اس کی سرخی یہ تھی ——— وزیر اعظم کی اپیل کہ نزاعی امور کو تین سال کے لیے التوا میں ڈال دیں :

PM for three-year moratorium on contentious issues.

وزیر اعظم نے کہا کہ ہمارے درمیان بہت سے اختلافات ہیں۔ اور یہ ایک فطری بات ہے کہ اختلافات ہوں۔ مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آزادی کے تقریباً آدھی صدی بعد بھی ہم گمبھیر مسائل سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے۔ ہم کو چاہیے کہ کم از کم اگلے تین سال کے لیے ہم اپنی نزاعی بحثوں کو طاق پر رکھ دیں اور اپنی ساری طاقت ملک کو ترقی کے راستہ پر اٹھانے میں لگا دیں۔

یہی اصول دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اور دوسرے شخص، اسی طرح ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان اختلاف اور نزاع پیدا ہو۔ اس دنیا میں بے اختلاف زندگی ممکن نہیں۔

اب اگر ہر شخص اور ہر گروہ اپنی اختلافی باتوں کو لے کر دوسروں سے الجھ جائے تو ترقی کا سفر ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے درست طریقہ یہ ہے کہ اختلافی یا نزاعی باتوں کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیا جائے اور اپنی ساری طاقت عملی تعمیر کے کام میں لگائی جائے۔ اگر بالفرض مستقل اعراض ممکن نہ ہو تو کم از کم کچھ مدت کے لیے تو اعراض کے اصول کو اختیار کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔

انسان بیک وقت دو محاذ پر اپنی قوت صرف نہیں کر سکتا۔ اگر وہ نزاع میں الجھے گا تو تعمیری کام رک جائیں گے۔ اور اگر تعمیری کاموں میں مصروف ہوگا تو نزاع کے میدان کو خالی چھوڑنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں عقل مندی کیا ہے۔ عقل مندی یہ ہے کہ نزاع کو ترک یا ملتوی کر کے اپنی تمام ممکن قوت کو تعمیر و ترقی کی راہ میں لگا دیا جائے۔

برتر حل

سوچنا (thinking) ہماری دنیا کا ایک ناقابل فہم حد تک عجیب عمل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان تحقیقات نے انسان کے علم میں اضافہ کرنے سے زیادہ انسان کی حیرانگی میں اضافہ کیا ہے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

Dr Rapaport, *Toward a Theory of Thinking*, 1951
W.E. Vinacke, *The Psychology of Thinking*, 1952
F.C. Bartlett, *Thinking*, 1958
Max Wertheimer, *Productive Thinking*, 1959

ان تحقیقات کے ذریعہ بے شمار نئی معلومات سامنے آئی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کے اندر ہمیشہ ایک نہایت اہم عمل جاری رہتا ہے۔ علماء نفسیات اس کو ذہنی طوفان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ذہن کسی نئے چیلنج سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ خود اپنی فطرت کے زور پر مسائل کے نئے حل تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہ عمل اس امکان کو بڑھا دیتا ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کچھ برتر حل آدمی کے سامنے آجائیں:

A process called brainstorming has been offered as a method of facilitating the production of new solutions to problems... These unrestricted suggestions increase the probability that at least some superior solutions will emerge (18/357).

یہ ریسرچ بتاتی ہے کہ آدمی جب کسی بحرانی حالت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر چھپی ہوئی فطری صلاحیت کے تحت اس کے اندر ذہنی طوفان (brainstorming) کی ایک کیفیت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ طوفان اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ کا ایک برتر حل (Superior solution) دریافت کرلے۔ اور مسئلہ کا برتر حل معلوم ہوجانے کے بعد کامیابی اتنی ہی ممکن ہوجاتی ہے جتنا شام کے بعد صبح کا آنا۔

اللہ کا یہ معاملہ کیسا عجیب ہے کہ اس نے مشکلات کو ہماری ترقی کا زینہ بنا دیا۔

شکر نہیں

محمد مارما ڈیوک پکتھال (۱۹۳۶-۱۸۷۵) نے لکھا ہے: "چند سال پہلے انگلستان کے اخباروں میں ایک بحث چلی تھی۔ یہ کہ اگر کوئی حسین اور مشہور اور نادر یونانی مجسمہ کسی کمرہ میں ایک زندہ انسانی بچہ کے ساتھ ہو اور اچانک اس کمرہ میں آگ پھیل جائے۔ اب اگر ایسی صورت حال ہو کہ ان دونوں میں سے صرف کسی ایک کو بچایا جانا ممکن ہو تو دونوں میں سے کس کو بچایا جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بہت سے مشہور اور قابل حضرات نے اس وقت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایسی حالت میں مجسمہ کو بچانا چاہیے اور بچہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ان حضرات کی دلیل یہ تھی کہ بچے تو ہزاروں کی تعداد میں ہر روز پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر قدیم یونانی آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ دوبارہ وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔

M.M. Pickthal, The Cultural side of Islam, pp. 3-4

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں کے بارہ میں انسان کے اندر شکر کا جذبہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ خدا کی نعمتیں انسان کو بے حساب مقدار میں اور ہر آن پہونچتی رہتی ہیں۔ نعمتوں کا بہت زیادہ ہونا اس کے انوکھے پن کو کھو دیتا ہے اور بہت کم آدمی اپنے اندر شکر کا احساس پیدا کر پاتے ہیں (وقلیل من عبادی الشکور)

انسان کا ایک بچہ ایک حیرت ناک معجزہ ہے۔ وہ آرٹ کے تمام انسانی نمونوں سے بے حساب گنا زیادہ قیمتی ہے۔ مگر آرٹ کے اعلیٰ نمونے چند ہیں، جب کہ انسانی بچے مسلسل کروروں کی تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انسانی آرٹ کی یہی ندرت اور انسانی بچوں کی یہی عمومیت ہے جس نے انسانی آرٹ کے بارہ میں لوگوں کے اندر استعجاب (Awe) کے احساس کو جگایا، مگر ان کے اندر خدا کے پیدا کیے ہوئے بچوں کے بارہ میں اس احساس کو نہیں جگایا۔

سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ انسان اللہ کا شکر کرے۔ اس کے اندر شکر کے سمندر کا سیلاب امنڈ آئے۔ مگر شیطان مختلف طریقوں سے چاہتا ہے کہ انسان کو اس افضل ترین عبادت سے ہٹا دے۔

اس دنیا میں جو شخص اللہ کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہے، اس کو شیطان کے فتنوں کو پہچاننا ہوگا۔ ورنہ وہ شکر گزاری کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

دعوت کا اصول

بینک کی آمدنی کا انحصار کسٹمر پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو بینک میں اپنی رقم جمع کرے یا بینک سے قرض لے۔ چنانچہ بینک کا یہ اصول ہے کہ اپنے کسٹمر کی آخری حد تک عزت کی جائے۔ بینک کے ملازموں کو ٹریننگ کے دوران بتایا جاتا ہے کہ کسٹمر ہمارے لیے بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے :

Customer is the king.

کسٹمر اگر کوئی نامناسب بات کہے اور بینک ملازم اس سے اس پر بحث کرنے لگے تو اندیشہ ہے کہ کسٹمر بدک کر واپس چلا جائے گا۔ اس لیے بینک ملازموں کو سکھایا جاتا ہے کہ تم کسٹمر سے کسی بات پر نہ الجھو۔ یہ سمجھ لو کہ کسٹمر ہمیشہ صحیح ہوتا ہے :

Customer is always right.

یہ طریقہ جو بینک اپنے کسٹمر کے ساتھ اختیار کرتا ہے، وہی طریقہ داعی اپنے مدعو کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ داعی اپنے مدعو سے کسی بات پر نہیں الجھتا۔ داعی یک طرفہ طور پر اپنے مدعو کی تلخ باتوں کو برداشت کرتا ہے تاکہ اس کے اور مدعو کے درمیان ہمدردی کی فضا قائم ہو سکے۔

دعوت کی لازمی شرط صبر ہے۔ اگر صبر نہیں تو دعوت بھی نہیں۔ صبر کوئی پسپائی یا خود سپردگی نہیں۔ یہ ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے جذبات پر قابو پانا ہے۔ یہ خدا کے دین کے تقاضوں کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو قربان کرنا ہے۔

مدعو وہ ہے جو ابھی گمراہی میں پڑا ہوا ہو۔ اور جو لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہوں، ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ حق کے اصولوں پر عمل کریں گے۔ وہ تو ابھی اپنی خواہش کے پرستار ہیں پھر وہ خدا کی پرستاری والا رویہ کیوں کر اختیار کر سکتے ہیں۔

داعی کو پیشگی طور پر یہ مان لینا چاہیے کہ مدعو کی طرف سے زیادتی کا سلوک ہوگا۔ مدعو کی طرف سے ایسے قول اور فعل کا مظاہرہ ہوگا جو داعی کے جذبات کو برہم کرنے والے ہوں۔ مگر ان سب کے باوجود داعی کو برداشت کے رویہ پر قائم رہنا ہے۔ اس برداشت کے بغیر کوئی شخص کبھی داعی نہیں بن سکتا۔

عقل کی بات

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ قرآن میں مختصر طور پر اور بائبل میں مفصل طور پر بیان ہوا ہے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے کئی سو سال پہلے شام و فلسطین کے درمیانی علاقہ میں پیدا ہوئے۔ بائبل میں اس جگہ کا نام عوض (Uz) بتایا گیا ہے۔

بائبل کا بیان ہے کہ حضرت ایوب کے یہاں سات ہزار بھیڑیں اور تین ہزار اونٹ اور پانچ سو جوڑی بیل اور پانچ سو گدھے اور بہت سے نوکر چاکر تھے، ایسا کہ اہل مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایسی آفتیں آئیں کہ حضرت ایوب کا تمام مال و دولت ختم ہو گیا۔ وہ بالکل مفلس ہو گیے۔ تاہم انھوں نے صبر کیا۔ بائبل کے الفاظ میں :

تب ایوب نے اٹھ کر اپنا پیراہن چاک کیا اور سر منڈایا اور زمین پر گر کر سجدہ کیا۔ اور کہا ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو (ایوب، باب ۱)

کچھ سالوں کے بعد حالات بدلے۔ حضرت ایوب کے پاس دوبارہ ہر قسم کا مال و اسباب مزید اضافہ کے ساتھ جمع ہو گیا۔ بائبل کا بیان ہے : اور خداوند نے ایوب کو جتنا اس کے پاس پہلے تھا اس کا دوچند دیا۔ یوں خداوند نے ایوب کے آخری ایام میں ابتدا کی نسبت زیادہ برکت بخشی۔ اس کے پاس چودہ ہزار بھیڑ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ اور ہزار جوڑی بیل اور ہزار گدھے ہو گیے (ایوب، باب ۴۲)

قرآن میں اس واقعہ کا تفصیلی ذکر نہیں۔ البتہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک نہایت اہم اور سبق آموز بات بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ایوب کو ہم نے دوبارہ سب چیز دیدی، اور اس واقعہ میں نصیحت ہے عقل والوں کے لیے (وذکریٰ لاولی الالباب، ص ۴۳)

اس مختصر فقرہ کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو اگر محرومی کا تجربہ ہو تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خدا نے اپنی رحمت سے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی محرومی آخری محرومی نہیں۔ یہاں ہر محرومی کے بعد دوبارہ یافت ہے۔ ہر کھونے کے بعد دوبارہ پانا ہے۔ بشرطیکہ آدمی صبر کرے اور خدا کے اعتماد پر اپنی جدوجہد کو برابر جاری رکھے۔

قدیم و جدید

ابتدائی دور میں عربوں نے عملی سائنس کو بہت کچھ ترقی دی۔ مثال کے طور پر یہ عرب ہی تھے جنھوں نے ساتویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے قابل استعمال گھڑی تیار کی۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں اعتراف کیا ہے کہ اُس زمانہ میں دمشق میں ایک مشہور گھڑی موجود تھی، اور اسی طرح ہارون رشید کے زمانہ کے بغداد میں :

Damascus had a famous clock and so did the Baghdad of Harun-al-Rashid's day. (p.261).

گھڑی کو مسلمانوں نے شروع کیا۔ مگر اس کو ترقی یافتہ صنعت بنانے کا تمام کام مغرب میں ہوا۔ آج یہ حال ہے کہ صرف گھڑیوں کی خریداری میں مسلم ملکوں کے کروروں ڈالر ہر سال مغربی دنیا میں پہونچ رہے ہیں۔

یہی معاملہ دوسری تمام جدید صنعتوں کا ہے۔ ان صنعتوں کا آغاز کرنے والے مسلمان تھے، مگر بعد کو وہ خود تو باہمی جھگڑوں میں پڑ گیے اور مغرب ان کی چیزوں کو لے کر ساری دنیا پر چھا گیا۔

مسلمانوں میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو مذکورہ ماضی پر فخر کرتے ہیں۔ مگر ان میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو حال میں دوبارہ وہ کام کرنے کا پیغام دے جو ماضی میں قدیم مسلمانوں نے کیا تھا۔ یہ محض فخر ہے، اور فخر کبھی عمل کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

اسٹیم پاور سے چلنے والے جہاز کے وجود میں آنے سے پہلے تک مسلمان سمندری جہاز رانی میں دنیا سے آگے تھے۔ حتی کہ ایک مورخ کے الفاظ میں، انھوں نے میڈیٹرینین سمندر کو عرب جھیل بنا دیا تھا۔ مگر آج اسٹیم شپ کے دور میں مسلمانوں کی کوئی جہاز راں کمپنی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بعد کو اپنے دور زوال میں پہنچنے کی وجہ سے مسلمانوں نے یہ صلاحیت کھو دی کہ وہ نئی چیزوں کو سیکھیں اور نئی تحقیقات پر دھیان دیں۔ انھوں نے ہر معاملہ میں "قدیم" سے جڑے رہنے کو مذہب سمجھا اور "جدید" سے وابستہ ہونے کو لامذہبیت سمجھنے لگے۔

امور دین (عقائد، عبادات، اخلاق) کے معاملہ میں ہم کو بلاشبہ پیچھے کی طرف دیکھنا ہے۔ مگر "امور دنیا" کے معاملہ میں ہم کو آگے کی طرف نظر رکھنا ہے۔ موجودہ مسلمان اس فرق کو نہ سمجھ سکے، یہی وجہ ہے کہ وہ زمانۂ حاضر میں ایک پچھڑی ہوئی قوم بن گیے۔

اعتراف

حضرت عمر فاروق ۱۳ھ سے ۲۳ھ تک خلیفہ رہے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک اعرابی مدینہ آیا۔ اس نے کہا کہ کون ہے جو مجھ کو وہ کلام پڑھائے جو محمدؐ پر اترا ہے۔ ایک شخص نے اعرابی کو سورہ التوبہ پڑھائی۔

یہ شخص عالم نہ تھا۔ اور اس وقت قرآن میں اعراب بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اس نے ایک آیت کو پڑھانے میں غلطی کردی۔ اس نے ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولہ (لام کو زیر کے ساتھ) پڑھایا۔ اس طرح پڑھنے سے آیت کا مطلب یہ ہوگیا کہ اللہ مشرکین سے اور اپنے رسول سے بری ہے۔ اعرابی نے یہ سن کر کہا: کیا اللہ اپنے رسول سے بیزار ہوگیا۔ اگر اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے تو میں بھی اس سے بہت زیادہ بیزار ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ کو اعرابی کے اس قول کی خبر ملی تو انھوں نے اعرابی کو بلایا۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے کہ میں خدا کے رسول سے بیزار ہوں۔ اعرابی نے جواب دیا کہ اے امیرالمومنین، میں مدینہ آیا۔ مجھ کو قرآن کا علم نہ تھا۔ میں نے کہا کہ کون ہے جو مجھ کو قرآن پڑھا دے۔ فلاں شخص نے مجھ کو سورہ التوبہ پڑھائی۔ اس کی ایک آیت اس نے مجھ کو اس طرح پڑھائی: ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولہ (لام کے زیر کے ساتھ) جب اس نے اس طرح پڑھایا تو میں نے کہا کہ کیا اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے۔ اگر اللہ اپنے رسول سے بیزار ہے تو میں بھی اس سے بہت زیادہ بیزار ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ معاملہ کو سمجھ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اے اعرابی، یہ اس طرح نہیں ہے جس طرح فلاں آدمی نے تم کو پڑھایا۔ اعرابی نے پوچھا کہ اے امیرالمومنین، پھر وہ کس طرح ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس طرح ہے: ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولُہ (لام کے پیش کے ساتھ) اعرابی نے اس کو سنا تو فوراً کہا: اللہ مشرکین سے بیزار ہے تو میں بھی خدا کی قسم، مشرکین سے بہت زیادہ بیزار ہوں۔

غلطی کرنا برا نہیں — بلکہ غلطی پر قائم رہنا برا ہے۔ زندہ انسان وہ ہے جس کو اس کی غلطی بتائی جائے تو فوراً وہ رجوع کرلے، اور مُردہ انسان وہ ہے جو غلطی بتانے کے بعد بھی رجوع کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنالے (البقرہ ۲۰۶)

بہتر حکومت

آزادی کے بعد آپ کی سب سے بڑی مشکل کیا رہی ہے، یہ ایک سوال ہے جس کو فرانسیسی مصنف اینڈرے مالراکس نے ایک بار جواہر لال نہرو سے پوچھا تھا۔ نہرو نے جواب دیا کہ ایک درست حکومت کو درست ذرائع سے وجود میں لانا :

What has been your greatest difficulty since Independence, is a question that Andre Malraux once asked Jawaharlal Nehru. "Creating a just state by just means," Nehru replied.

جواہر لال نہرو کو ہندستان میں کامل اقتدار حاصل تھا۔ اس کے باوجود بہتر نظامِ حکومت بنانے کے لیے وہ اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہتر نظامِ حکومت بنانے کا کام حکومت کی طاقت سے نہیں ہوتا۔ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو حکومت سے باہر رہ کر اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔

اصل یہ ہے کہ بہتر نظام حکومت بنانے کا کام بہتر افراد بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ لوگ خالص تعمیری انداز میں ذہن بنانے کے کام میں لگیں۔ وہ تقریر و تحریر اور دوسرے ممکن ذرائع سے ایک ایک شخص کے ذہن میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔

یہ کام خاموش اور پر امن انداز میں لمبی مدت تک جاری رہے۔ یہ گویا ایک قسم کا تعمیری لاوا پکانا ہے۔ جب افراد کی قابل لحاظ تعداد میں فکر کا لاوا پکتا ہے اور افراد کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے تو اس کے بعد سماج میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔ اور جب سماج کی اصلاح ہو جائے تو اس کے بعد اصلاح یافتہ حکومت بھی لازماً بن کر رہتی ہے۔

افراد میں انقلاب سماج میں انقلاب لانے کا باعث بنتا ہے۔ اور سماج میں انقلاب حکومت میں انقلاب لے آتا ہے۔ کیوں کہ حکومت (جمہوری نظام میں) سماج کے اندر سے نکل کر ہی تشکیل پاتی ہے۔

تعمیری لاوا پکانا ایک انتہائی خاموشی کا کام ہے۔ اس میں آدمی کو زیادہ کرنا پڑتا ہے مگر اس کو کم کا کریڈٹ بھی نہیں ملتا۔ یہ قوم کا گنبد کھڑا کرنے خاطر اس کی بنیاد میں دفن ہو جانا ہے۔ اس کام کی یہی مشکل نوعیت ہے جس کی بنا پر لوگ اس میدان میں محنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

احساس اصلاح

ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ کتابت کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مجھ کو الرسالہ بہت پسند ہے۔ مگر آپ کی ایک بات مجھے کھٹکتی ہے۔ آپ اکثر مسلمانوں کی کمیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے تو مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ آپ ایک کاتب ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ حرف 'ج' اور 'ع' کا دائرہ صحیح نہ بناتے ہوں۔ اب اگر آپ کے استاد آپ کی اس کمی کو بتائیں تو کیا آپ کہیں گے کہ استاد صاحب میرے اندر احساسِ کمتری پیدا کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ اسی ذاتی مثال سے آپ الرسالہ کے اُن مضامین کو سمجھ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن مضامین کا مقصد مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ احساسِ اصلاح پیدا کرنا ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ اپنی کمیوں کی اصلاح کیے بغیر کوئی شخص یا گروہ اس دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا۔

عربی کا ایک مثل ہے کہ جو شخص تم کو نصیحت کرے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہاری تعریف کرے (من هو ناصحك خير لك ممن هو مادحك) یہ مثل صد فی صد درست ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی کے ساتھ خیر خواہی رکھتا ہو، وہ یہی کرے گا کہ وہ اس کی کمیوں کی نشاندہی کرے گا اور اس کی کوتاہیوں پر اس کی فہمائش کرے گا۔ یہی سچے مصلح کا طریقہ ہے۔

قرآن میں گھاٹے (خُسر) سے بچنے کے لیے جو لازمی صفات بتائی گئی ہیں، ان میں سے ایک ضروری صفت تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ہے۔ یعنی آپس میں ایک دوسرے کو حق و صبر کی نصیحت کرتے رہنا۔ وہی گروہ اس دنیا میں نقصان اور بربادی سے بچ سکتا ہے جس کے افراد میں یہ روح زندہ ہو کہ جب وہ اپنے بھائی کو حق کے راستہ سے ہٹا ہوا پائے تو فوراً اس کو ٹوکے، اور جب بھی وہ اس کو بے صبری کی طرف جاتا ہوا دیکھے تو اس کو صبر کی اہمیت سے آگاہ کرے (سورہ العصر)

صحابۂ کرام کے اندر نصیحت کرنے کا جذبہ بھی پوری طرح موجود تھا اور نصیحت سننے کا بھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک معاملہ میں ایک بار فیصلہ دیا۔ حضرت علی کو اس فیصلہ میں غلطی نظر آئی۔ انھوں نے اس پر ٹوکا۔ حضرت عمرؓ اگرچہ خلیفہ اور حاکم تھے، انھوں نے فوراً اس کو مان لیا اور کہا: اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

موت کا نشانہ

ڈاکٹر کرنی سنگھ (۱۹۸۸-۱۹۲۴) بیکانیر کے مہاراجہ تھے۔ ریاست کے خاتمہ کے بعد وہ ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہو گیے۔ ان کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک ماہر نشانہ باز (Shooter) تھے۔ وہ ہندستان کی طرف سے پانچ اولمپک (روم، ٹوکیو، میکسیکو، میونخ، ماسکو) میں کامیابی کے ساتھ شریک ہوئے۔ وہ ۱۷ سال تک نشانہ بازی میں غیر مفتوح چمپین (Unbeated champion) بنے رہے۔ ۷ ستمبر ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں برین ہیمورج سے ان کا انتقال ہو گیا جب کہ ان عمر ۶۴ سال تھی۔

نشانہ بازی (Shooting) ایک قدیم فن ہے۔ پہلے غلیل اور گوپھن اور تیر کے ذریعہ نشانہ اندازی ہوتی تھی۔ اب رائفلوں اور بندوقوں کے زمانہ میں اس نے ایک نئے فن (آرٹ آف فائرنگ) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کے بڑے بڑے عالمی مقابلے ہوتے ہیں جہاں مصنوعی نشانوں (مثلاً مٹی کی چڑیا) پر رائفل وغیرہ سے گولی ماری جاتی ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک کتاب کا نام یہ ہے:

C.E. Chapel, The Art of Shooting (1960)

آدمی خارجی چیزوں پر نشانہ لگاتا ہے، حالاں کہ عین اسی وقت وہ خود موت کے نشانہ پر ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنی زد میں لے کر خوش ہوتا ہے، حالاں کہ وہ خود پوری طرح موت کی زد میں ہوتا ہے۔ آدمی خارجی نشانہ اندازی کا چمپین بنتا ہے حالاں کہ اس کو داخلی نشانہ اندازی کا چمپین بننا چاہیے۔

کتنا کم جانتے ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کتنے غیر ماہر ہیں وہ لوگ جن کا نام دنیا والوں نے ماہرین کی فہرست میں لکھ رکھا ہے۔

جاننے والا وہ ہے جو اپنے آپ کو جانے۔ نشانہ کا ماہر وہ ہے جو اپنے آپ پر نشانہ لگا سکے۔ خارج پر نشانہ لگانے والوں کو دنیا میں قیمت ملتی ہے، اپنے آپ پر نشانہ لگانے والوں کو آخرت میں ان کی قیمت ملے گی، خواہ دنیا والوں نے ان کے اس عمل کو جانا بھی نہ ہو۔

دوسروں پر نشانہ لگانا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور اپنے آپ پر نشانہ لگانا سب سے زیادہ مشکل کام۔ دونوں میں اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ خارجی نشانہ بازی کے میدان میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مگر داخلی نشانہ کا میدان ہر طرف سونا نظر آتا ہے۔

سبق آموز

امریکی میگزین ٹائم (۱۰ فروری ۱۹۹۲) کی کور اسٹوری کا موضوع ہے ـــــــ امریکہ کے بارہ میں جاپان کا ذہن، اور جاپان کے بارہ میں امریکہ کا ذہن :

America in the mind of Japan,
Japan in the mind of America.

اس رپورٹ کا خلاصہ، میگزین کے الفاظ میں، یہ ہے کہ امریکہ اور جاپان کی بظاہر نا اتفاقی ایک زیادہ گہری سچائی کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ یہ کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کو اپنی ضرورت سمجھتی ہیں :

Friction between the U.S. and Japan masks a deeper truth : the two nations need each other. (p.8)

میگزین نے لکھا ہے کہ امریکہ اگرچہ اب بھی بہت طاقت ور اقتصادیات کا مالک ہے مگر اب وہ اپنے بارہ میں محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک تخفیف شدہ چیز ہے۔ پرانا دشمن، سوویت یونین، اب ختم ہو گیا ہے۔ جاپان کے مقابلہ میں امریکہ ۴۱ بلین ڈالر کے بقدر تجارتی خسارہ میں ہے۔ اس اعتبار سے کچھ امریکی جاپان کو اپنا نیا دشمن سمجھتے ہیں :

America, still the most powerful economy, nonetheless feels itself to be somehow the diminished thing. The old enemy, the Soviet Union, has vanished. With the U.S. running a $41 billion trade deficit with Japan, the once deferential partner begins to look to some Americans like the new enemy. (p.9)

دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی تو امریکہ کی حیثیت غالب کی تھی اور جاپان کی حیثیت مغلوب کی مگر آج یہ ترتیب الٹ گئی ہے۔ اس کی وجہ تمام تر اخلاقی ہے۔ امریکہ نے ہتھیار کے اعتبار سے جاپان کے اوپر غلبہ حاصل کیا تھا۔ مگر آخر کار کردار کی طاقت نے اپنا کام کیا۔ جاپان زیادہ بہتر کردار سے مسلح ہو کر امریکہ کے اوپر غالب آگیا۔

میگزین کے مطابق، اکثر جاپانی اور اسی طرح بہت سے امریکی بھی، امریکہ کے اقتصادی مسائل کی ذمہ داری خود امریکہ کے اوپر ڈالتے ہیں۔ مساوکو نی ہیرو (Masao Kunihiro) جو ایک جاپانی اینتھراپولوجسٹ ہیں، انھوں نے سوالیہ انداز میں کہا کہ ایمرسن کے قدیم عقیدہ کا کیا ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر تم ایک اچھا چوہے دان بناؤ گے تو دنیا خود چل کر تمہارے دروازہ پر پہنچ جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہی وہ چیز تھی جس نے امریکہ کو اس اقتصادی اور صنعتی طاقت تک پہنچایا جیسا کہ وہ آج ہے۔ مگر ہم میں سے اکثر لوگ، صحیح یا غلط طور پر، یہ خیال رکھتے ہیں کہ امریکہ اب ایسے چوہے دان نہیں دے رہا ہے جو جاپانی چوہے دان سے اچھا ہو۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب امریکہ میں کارکردگی کا معیار گھٹ گیا ہے :

Whatever happened to the good old Emersonian credo that if you build a better mousetrap, the world will beat a path to your door. That is what made America what it is today, economically and industrially powerful. But many of us, rightly or wrongly, now feel that the U.S. is no longer turning out mousetraps which are better than ours. (p.14)

ایک اور جاپانی مبصر یوشیو ساکوراچی (Yoshio Sakurauchi) نے امریکہ کی کمی کے بارہ میں عام جاپانی تاثر کو بتاتے ہوئے کہا کہ امریکہ کے تجارتی مسئلہ کی جڑ امریکی کارکن کی کارکردگی کا ناقص معیار ہے :

The root of America's trade problem lies in the inferior quality of American labor. (p.14)

دوسری عالمی جنگ میں امریکہ نے جاپان کے خلاف جو ظالمانہ سلوک کیا تھا، اگر جاپان یہ کرتا کہ وہ اپنے زبان و قلم کو امریکہ کے ظلم اور اس کی سازش کے خلاف پروپگنڈے میں لگا دیتا تو جاپا کچھ بھی حاصل نہ کرتا۔ بلکہ جنگ کے بعد جو کچھ اس کے پاس بچا تھا اس کو بھی وہ لفظی احتجاج کی مہم میں کھو دیتا۔

جاپان نے امریکہ کے سلوک پر "صبر" کر لیا۔ اس نے امریکہ کے خلاف شور و غل کرنے کے بجائے خود تعمیری کو اپنا مشن بنایا۔ اس کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ صرف چالیس سال کی مدت میں تاریخ بدل گئی۔ جو پیچھے تھا وہ آگے ہو گیا۔ اور جس نے آگے کی سیٹ پر قبضہ کر رکھا تھا اس کو مجبور ہو کر پچھلی سیٹ پر واپس جانا پڑا۔

تاریخ کا صفحہ

اسپین میں تقریباً ۸۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ ۱۴۹۲ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ خاتمہ کے وقت بھی مسلمان اپنے حریف اسپینیوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مسیحیوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسیحیوں نے متحد ہو کر اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی اور مسلمانوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے اپنے آپ کو بے حد کمزور کر لیا۔

مسلم دور حکومت میں بھی اسپین کا ایک نسبتاً چھوٹا حصہ مسیحیوں کے پاس تھا۔ اس کو اپنا سیاسی مرکز بنا کر وہ مسلم حکومت کے خلاف کارروائی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر آخری دور میں اپنا رقبہ کافی بڑھالیا تھا اور مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ (Granada) رہ گیا تھا۔

دور آخر کا ایک مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن تھا، مسیحی حکمراں فردی نند (Ferdinand II) نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر تھا۔ اس نے فردی نند کو جواب میں لکھا کہ "غرناطہ کے دار الضرب میں اب سونے کے سکوں کے بجائے فولادی تلواریں تیار کی جارہی ہیں تاکہ مسیحیوں کی گردنیں ماری جائیں" اس کے بعد دونوں کے درمیان کئی مسلح تصادم ہوئے۔ آخر کار ۸۸۷ھ میں لوشہ کے مقام پر دونوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس میں فردی نند کی فوجوں کو مکمل شکست اور سلطان ابوالحسن کی فوجوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

اس کے بعد فردی نند نے از سر نو اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اس وقت مسیحی اسپین میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک اراغون (Aragon) جہاں فردی نند کی حکومت تھی۔ دوسرا قسطلہ (Castile) جہاں ملکہ ازبیلا (Isabella I) تخت کی مالک تھی، فردی نند نے یہ دانش مندی کی کہ ازبیلا کو راضی کر کے ۱۴۶۹ء میں اس سے نکاح کر لیا۔ اس طرح دونوں کو ملا کر ایک بڑی مسیحی سلطنت وجود میں آگئی۔

ایک طرف مسیحی دنیا میں یہ اتحادی واقعہ ہوا۔ دوسری طرف یہ اختلافی واقعہ پیش آیا کہ سلطان ابوالحسن کے لڑکے ابوعبداللہ محمد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی، وہ سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ اب سلطان ابوالحسن کی حکومت صرف چار ہزار مربع میل پر مشتمل ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف فردی نند کی سلطنت کا رقبہ بڑھ کر سوا لاکھ مربع میل ہو گیا۔ اس صدمہ کے بعد

سلطان ابوالحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی بینائی بھی ختم ہوگئی۔

سلطان ابوالحسن اس کے بعد غرناطہ کے تخت سے دستبردار ہوگیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو سلطان مقرر کیا۔ اس کے بعد ایک سازش کے تحت ابوعبداللہ زغل کو سلطنت سے ہٹا دیا گیا اور ابوعبداللہ محمد پورے سلطنتِ غرناطہ کا حکمراں بن گیا۔ مگر اس کے اندر اپنے باپ والی دانش مندی موجود نہ تھی۔ چند مقابلوں میں اس نے مسیحی حکمراں سے شکست کھائی۔

آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قلعہ کو مسیحی فوجوں نے گھیر لیا۔ ابوعبداللہ محمد جس نے اپنے اور اپنے چچا کے مقابلہ میں بہادری دکھائی تھی وہ مسیحی فوجوں کے مقابلہ میں صرف بزدل ثابت ہوا۔ آخر کار ۲ جنوری ۱۴۹۲ کو اس نے قلعہ اور غرناطہ کی دستبرداری کے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ پر ایک طرف فاتح فردی نند نے اپنا دستخط ثبت کیا۔ اور دوسری طرف مفتوح ابوعبداللہ محمد نے۔

ایک مورخ نے اسپین کے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غرناطہ کے آخری مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن نے فردی نند اور ازبیلا کو شکست دی تھی۔ مگر اس کے اپنے لڑکے ابوعبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی جو آخر کار اس کے باپ کے زوال کا سبب بنی۔

The last ruler of Granada, Sultan Abul-Hasan, defeated Ferdinand II (1452-1516) and Queen Isabella, but his own son, Abu Abdullah, made a coup against his father which resulted to the downfall of his father.

اس دنیا میں باہمی اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے اور باہمی اختلاف سب سے بڑی کمزوری۔ یہ بلاشبہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے۔

عبرت ناک

ہندستان ٹائمس (۱۸ اپریل ۱۹۹۲) میں صفحہ ۱۳ پر ایک بڑی عبرت ناک روداد شائع ہوئی ہے۔ مسٹر پرکاش لاہا ہندستان اسٹیل میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ ان کے دو ہونہار لڑکے تھے جن کا نام پریاجیت لاہا اور پرسن جیت لاہا تھا۔ دونوں لڑکوں کی تعلیم سینٹ زیویرس اسکول میں ہوئی۔ ان کو انگلش لٹریچر کا خاص ذوق تھا۔ دونوں شاندار طور پر ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔

بظاہر وہ ہر طرح صحت مند تھے۔ اچانک ایک صبح کو پرسنجیت نے محسوس کیا کہ گھر کی سیڑھیاں چڑھنے میں ان کو مشکل ہو رہی ہے۔ چند دن بعد وہ اپنے اسکول میں لڑکھڑا کر گر پڑے۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ڈاکٹر نے ان کو وھیل چیر پر ڈال دیا۔ پورے خاندان کے لیے یہ بڑا سخت صدمہ تھا۔ ایک نوجوان بیٹا چلنے پھرنے سے معذور تھا۔

مگر معاملہ یہیں نہیں رکا۔ اس کے بعد عین یہی بیماری دوسرے بھائی پریاجیت کو بھی ہوگئی۔ دونوں بھائی چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ آخر کار ۴ جولائی ۱۹۹۰ کو پرسنجیت کا انتقال ہوگیا۔ اب پریاجیت کو اندیشہ ہوا کہ وہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے اپنی آٹوبیاگرفی لکھنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی نظمیں لکھ کر وہ اپنا دل بہلاتا۔ مگر تین ماہ بعد ۸ اکتوبر ۱۹۹۰ کو پریاجیت کا بھی انتقال ہوگیا۔

پریاجیت لاہا کی نظمیں اس کی موت کے بعد شائع کی گئی ہیں۔ اس کی ایک نظم کی دو لائنیں یہ ہیں ـــــ بہترین ڈاکٹر بھی آخر کار اپنے مریضوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وقت آنے پر ہر عمارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے :

Even the best doctors finally lose their patients. Buildings crumble in time.

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے رپورٹ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ اس طرح تین مہینے کے اندر دونوں بھائی، جن میں سے ہر ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا اور جن کے لیے شاندار مستقبل متوقع تھا، وہ اس دنیا سے چلے گئے، اس کے بغیر کہ وہ اپنی آرزوؤں کو پورا کر سکیں :

Thus within the space of three months the two brothers, both remarkable in their own ways and with promises of bright futures, departed without being able to fulfill their ambitions.

اس دنیا میں کسی چیز کو پائداری حاصل نہیں۔ یہاں کھڑی کی جانے والی تمام عمارتوں کے لیے مقدر ہے کہ ایک روز وہ ڈھ پڑیں۔ مگر کبھی کسی عمارت کو بنتے ہی گرادیا جاتا ہے تاکہ لوگ چوکنے ہوں اور غافل لوگ بھی ہونے والے واقعہ پر دھیان دے سکیں۔

یہاں ہر پیدا ہونے والا آخر کار مر جاتا ہے۔ مگر بعض افراد کو کم عمری ہی میں موت دے دی جاتی ہے تاکہ لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور جو لوگ بے ہوشی میں پڑے ہوئے ہیں وہ بھی ہوش میں آکر اپنی اصلاح کر لیں۔

یہاں ہر آدمی کی آرزوئیں غیر تکمیل شدہ رہ جاتی ہیں، یہاں بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنی تمناؤں کو اپنے سینہ میں لیے ہوئے اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ تاہم کبھی اس حقیقت کو مزید کھولنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو مذکورہ صورت میں اٹھا لیا جاتا ہے تاکہ اس معاملہ کی انتہائی مثال دنیا میں قائم ہو اور اندھے لوگ بھی اس کو دیکھیں اور بہرے لوگ بھی اس کو سن لیں۔

ایک بچہ کے ساتھ جب مذکورہ قسم کا واقعہ پیش آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک نوعمر بچہ کا کیا قصور تھا کہ اس کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آیا۔ مگر اصل مسئلہ "قصور" کا نہیں ہے، بلکہ خدا کے تخلیقی منصوبہ کا ہے۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس حقیقت کو بتانے کے لیے خالق کائنات نے مختلف انتظامات کیے ہیں۔ انھیں میں سے ایک انتظام یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں زندگی کی غیر مستقل حیثیت کو بتانے کے لیے انتہائی مثال قائم کر دی جائے۔ نوعمری کی موت اسی قسم کی ایک انتہائی مثال ہے۔

موت اور حادثہ کے واقعات آنکھیں کھولنے کے لیے پیش آتے ہیں۔ عقل مند وہ ہے جو ان واقعات سے سبق لے۔ نادان وہ ہے جو غیر متعلق سوالات میں الجھ کر رہ جائے۔

حفاظتی ڈھال

قرآن (الانبیاء ۳۲) میں فرمایا گیا ہے کہ ——— اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا (وجعلنا السماء سقفا محفوظا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان (بالائی فضا) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و قدرت سے اس طرح بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے مضر رساں چیزوں سے حفاظت کا ذریعہ بن جائے۔ اس نظام خداوندی کے بے شمار پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک جزء غالباً وہ فضائی گیس ہے جس کو اوزون (ozone) کہا جاتا ہے۔

سورج ہماری زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کے مادہ کو تقسیم کیا جائے تو اس سے ہماری زمین جیسے بارہ لاکھ کرے بن جائیں گے۔ یہ سورج ہمارے لیے روشنی اور حرارت کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا موجودہ فاصلہ بے حد اہم ہے، اگر زمین سے سورج کا فاصلہ موجودہ فاصلہ سے کم ہوتا تو اس سے آنے والی روشنی اور حرارت اتنی شدید ہوتی کہ زمین پر کسی ذی حیات کے لیے زندہ رہنا ہی ناممکن ہو جائے۔

سورج کی جو شعاعیں زمین پر آتی ہیں ان میں بعض نہایت مضر اجزاء ہوتے ہیں۔ مثلاً ان آفتابی شعاعوں کا ایک جزء وہ ہے جس کو الٹراوائیلٹ شعاعیں (ultraviolet rays) کہا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں ذی حیات مخلوق کے لیے سخت مضر ہیں۔ ان سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور ان کی زیادتی انسان اور حیوان کو ہلاک کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

الٹراوائیلٹ شعاعیں مسلسل سورج سے نکل کر زمین کی طرف آرہی ہیں۔ اس کے باوجود انسان اور حیوان کیوں زمین پر زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے اوپر کئی سو میل کی جو فضا (atmosphere) ہے۔ اس کی مختلف تہوں میں سے ایک تہ وہ ہے جو اوزون گیس پر مشتمل ہے۔

یہ اوزون ایک قسم کی آکسیجن گیس ہے۔ اس کے مخصوص مالیکولر ڈھانچہ کی وجہ سے اس میں یہ صفت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اوپر سے آنے والی الٹراوائیلٹ شعاعوں کو جذب کر لے اور ان کو زمین کی سطح تک پہنچنے نہ دے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق، یہی اوزون گیس کی تہ ہے جو انسان کو

الٹراوائیلٹ شعاعوں کے مضر اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر بالائی فضا میں ایک محفوظ چھت قائم کی۔ بالائی فضا (atmosphere) کے بارہ میں موجودہ زمانہ میں جو سائنسی تحقیقات ہوئی ہیں وہ قرآن کے اس بیان کے حق میں ایک علمی تائید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ فضا کے اوپر اوزون گیس کی ایک موٹی تہہ ہے جو کرۂ ارض کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فضائی چھتری انسان کے لیے ایک حفاظتی ڈھال کا کام کر رہی ہے۔ اس حفاظتی ڈھال کے بغیر انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ زمین کے اوپر آباد ہو اور یہاں تمدن کی تعمیر کرے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بالائی فضا میں ۲۰ کیلومیٹر اور ۵۰ کیلومیٹر کی بلندی کے درمیان موجود گیسوں میں قدرتی طور پر ایک ردعمل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں بننے والے نئے قسم کے مالیکیول سے ایک گیس تیار ہوتی ہے جس کو اوزون کہا جاتا ہے۔ یہ اوزون زمین کے چاروں طرف فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ الٹراوائیلیٹ شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح وہ زمین کے اوپر زندگی کے لیے ایک اہم حفاظتی ڈھال کا کام کرتی ہے :

In the region between about 20 and 50 kilometers the monatomic oxygen reacts with 02 to form ozone (03). The resulting worldwide layer of ozone, although its relative concentration is less than 1/10,000, is sufficient to absorb ultraviolet radiation and thereby serve as a vital protective shield for life on earth. (2/322-23)

موجودہ زمانہ میں صنعتی تمدن نے انسان کے لیے جو نئے مسائل پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک خطرناک مسئلہ یہ ہے کہ جدید صنعتوں کی پیدا کردہ بعض گیسوں کی وجہ سے اوزون کی تہہ کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ فضا کی اوزون میں رخنہ پڑنے سے، کم از کم جزئی طور پر، الٹراوائیلیٹ شعاعوں کو زمین تک پہنچنے کا راستہ مل جائے اور پھر انسان کے لیے طرح طرح کے ناقابل حل مسائل پیدا ہو جائیں۔

موجودہ زمانہ میں اس پر باقاعدہ ریسرچ کی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں کافی لٹریچر شائع کیا گیا ہے۔ ٹائم میگزین (۱۷ فروری ۱۹۹۲) نے اس مسئلہ کو اپنی کور اسٹوری بنایا ہے۔ اس کا عنوان

ہے ـــــ ختم ہوتی ہوئی اوزون، خطرہ قریب آرہا ہے :

Vanishing ozone: The danger comes closer.

زندگی کے لیے یہ ضروری گیس جس کی بربادی کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، وہ آکسیجن کی ایک قسم ہے جس کے مالیکول میں تین ایٹم ہوتے ہیں جب کہ عام آکسیجن کے مالیکول میں دو ایٹم ہوتے ہیں۔ ڈھانچہ میں اس سادہ تبدیلی نے اوزون میں یہ صلاحیت پیدا کردی ہے کہ وہ الٹراوائیلٹ شعاعوں کو جذب کرسکے :

The vital gas being destroyed is a form of oxygen in which the molecules have three atoms instead of the normal two. That simple structure enables ozone to absorb ultraviolet radiation. (p.41)

سائنسی نقطۂ نظر سے مالیکول کے ایٹمی ڈھانچہ میں یہ تبدیلی ہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر اوزون اس صفت کی حامل گیس بن گئی ہے کہ وہ سورج سے آنے والی مضر گیس کو اپنے اندر جذب کرلے اور اس کو زمین کی سطح تک پہنچنے نہ دے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بالائی فضا میں اوزون کی یہ گیسی چادر ہم کو مسلسل طور پر الٹراوائیلٹ شعاعوں کے مہلک اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔

مگر کوئی عقلی یا سائنسی دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے موجود نہیں کہ ایٹم کی تعداد میں تبدیلی بذاتِ خود اپنے اندر اس قسم کی انوکھی اور مفید صلاحیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس آسمانی آگ سے بچانے والا خدا ہے۔ ظاہری طور پر مذکورہ تبدیلی اس لیے پیدا کی گئی تاکہ آدمی اس کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ وہ اس ظاہری واقعہ کو دیکھ کر اندرونی حقیقت تک پہنچ سکے۔

ایک طرف فطرت کے نظام میں اوزون گیس کا ہونا، دوسری طرف جدید صنعتی نظام کے تحت اوزون گیس کی تباہی، یہ دونوں واقعات بے حد سبق آموز ہیں، اور ان میں سوچنے والوں کے لیے عظیم نشانی پائی جاتی ہے۔

بالائی فضا میں اوزون گیس کی موٹی تہ کا پایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ جس ہستی نے دنیا کا نظام بنایا، اس کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ زمین پر بسنے والے انسانوں کی کیا ضرورتیں ہوں گی۔ اس نے تجربہ سے پہلے یہ جانا کہ سورج کی شعاعوں میں افادیت کے ساتھ نقصان کے پہلو بھی موجود ہیں۔ اس نے افادیت کے پہلو کو مستحکم کیا اور نقصان والے پہلو سے بچاؤ کا انتظام کردیا تاکہ انسان جب زمین پر بسے تو وہ سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے محفوظ رہے، سورج کی صرف

مفید شعاعیں انسانوں تک پہنچ سکیں۔

اب دوسرے رخ کو دیکھئے جو بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ انسان نے ساٹھ سال پہلے وہ چیز دریافت کی جس کو ایرکنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے انسان کو غیر معمولی طور پر راحت کا سامان دیا۔ ایرکنڈیشنڈ مکان اور دفاتر اور مختلف بلڈنگیں ماڈرن زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ جب یہ صنعت دریافت ہوئی تو وہ خیر ہی خیر نظر آتی تھی، مگر جدید تحقیقات نے بتایا کہ اس خیر میں شر بھی چھپا ہوا ہے۔

موجودہ ایرکنڈیشننگ کا سسٹم سی ایف سی پر مبنی سسٹم (cfc-based system) ہے۔ سی ایف سی ٹکنالوجی آج انسان کے لیے زبردست خطرہ بن گئی ہے۔ سی ایف سے مراد کلورو فلورو کاربن (chlorofluorocarbons) ہے۔ یہ ایک کیمیکل ہے جو ایرکنڈیشننگ کے سامانوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کیمیکل کو تیار کرنے کے لیے جو کارخانے بنائے گئے ہیں وہ اس کی تیاری کے دوران ایک ضمنی پیداوار (by-product) تیار کرتے ہیں جس کو سی آئی او یا کلورین مونو آکسائڈ (chlorine monoxide) کہا جاتا ہے۔ یہی سی آئی او کا مادہ ہے جو دراصل اوزون کی تہ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ حتی کہ اس نے بالائی فضا میں ایک بڑا سوراخ پیدا کر دیا ہے جس سے سورج کی مذکورہ مضر شعاعیں زمین پر آنا شروع ہو گئی ہیں۔

اب امریکہ وغیرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ریسرچ ہو رہی ہے تاکہ کوئی ایسا متبادل مادہ دریافت کیا جائے جس کے ذریعہ مذکورہ مضر کیمیکل پیدا کیے بغیر ایرکنڈیشننگ کے سامان بنائے جا سکیں۔

اب یہاں دو نمونے ہیں۔ ایک فطرت (نیچر) کا۔ دوسرے انسانی صنعت کا۔ فطرت کا نمونہ بتاتا ہے کہ اس میں پیشگی طور پر یہ انتظام موجود تھا کہ سورج کی مضر شعاعیں زمین کی سطح تک نہ پہنچیں۔ تاکہ انسان محفوظ طور پر زمین پر آباد ہو سکے۔ دوسری طرف صنعتی دور کے صنعت کاروں کو پیشگی طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی ایرکنڈیشننگ کی صنعت فطرت کے قیمتی توازن کو توڑ دے گی اور انسان کے لیے سخت ناموافق صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

یہ صورت حال اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اس کی منصوبہ بندی کے پیچھے ایک بالاتر خدائی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ اگر یہاں ایسے ذہن کی کارفرمائی نہ ہوتی تو فطرت کے نظام میں

بھی بار بار اسی قسم کے خلا اور نقائص ظاہر ہوتے جو انسانی صنعت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے۔ تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی (الملک ۱-۴)

خلاصہ کلام

اللہ تعالیٰ نے سورج پیدا کیا، سورج کی پیدائش زمین پر انسان کی آبادی سے بہت پہلے ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ سورج کی شعاعوں کا ایک جز، (الٹراوائیلٹ) انسان کے لیے مضر ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر بالائی فضا میں ایک محکم حفاظتی انتظام کر دیا جو انسان کو اس مضر شعاع سے بچاتا رہے۔

دوسری طرف انسانی انجنیروں اور سائنس دانوں نے زمین پر ایک انڈسٹری قائم کی۔ اس انڈسٹری سے ایک ایسی گیس نکلنے والی تھی جو فضا میں بلند ہو کر اس حفاظتی انتظام میں رخنہ پیدا کر دے جو انسان کو مضر آفتابی شعاعوں سے بچانے کے لیے کیا گیا ہے۔ مگر انسانی ماہرین کو اس کا علم صرف اس وقت ہوا جب کہ ان کی انڈسٹری کے یہ مضر نتائج عملاً ظہور میں آگئے اور انسان ان کا شکار ہونے لگا۔

یہ تقابلی مثال بتاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق نہ صرف یہ کہ ذہن کے بغیر نہیں ہو سکتی، بلکہ انسان جیسی ذہانت بھی اس عمل تخلیق کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے لیے مافوق ذہانت (سپر ذہانت) درکار ہے۔ اس قسم کے اعلیٰ ذہن کے بغیر موجودہ بامعنی کائنات کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

دو طریقے

تحریک چلانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک دعوت کا طریقہ، اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں انقلابی (Revolutionary) طریقہ کہا جاتا ہے۔ دعوتی طریقہ کا نمونہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے۔ اور انقلابی طریقہ کا نمونہ وہ ہے جو کمیونسٹ پارٹیوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔

آج کل کے مسلمانوں میں انقلابی طریقہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ہر جگہ کے مسلمان انقلابی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے مفروضہ حریف کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ جن لوگوں کے حالات گولی اور بم استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں وہ گولی اور بم استعمال کر رہے ہیں۔ اور جن لوگوں کے حالات میں اس حد تک جانے کا موقع نہیں ہے، وہ لفظی بمباری کے ذریعہ اپنی انقلابی مہم چلانے میں مشغول ہیں۔

دعوت کا طریقہ نبیوں کا طریقہ ہے اور پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس کے برعکس نام نہاد انقلابی طریقہ مارکس اور لینن کی سنت ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ہر سنجیدہ آدمی جانتا ہے۔ اسلامی الفاظ یا اسلامی اصطلاحات بول کر اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ تمام مسلمان "انقلابی طریقہ" کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ کسی کو بھی "دعوتی طریقہ" سے دلچسپی نہیں۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلابی طریقہ ردعمل کا طریقہ ہے، اور دعوتی طریقہ صبر اور اعراض کا طریقہ۔ اور ردعمل کے مقابلہ میں صبر و اعراض بلاشبہ مشکل ترین کام ہے۔

انقلابی طریقہ کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر ہے اور دعوتی طریقہ کی بنیاد دوسروں سے محبت پر۔ انقلابی طریقہ عاجلانہ کارروائی کا طریقہ ہے اور دعوتی طریقہ انتظار کا طریقہ۔ انقلابی طریقہ میں دوسروں کو پتھر مارا جاتا ہے اور دعوتی طریقہ میں خود پتھر کھانے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے۔ انقلابی طریقہ میں شہرت ملتی ہے اور دعوتی طریقہ میں گم نامی۔ انقلابی طریقہ میں خواہش رہنما ہوتی ہے اور دعوتی طریقہ میں کتاب و سنت کو رہنما بنانا پڑتا ہے۔ انقلابی طریقہ میں نشانہ خارج میں ہوتا ہے اور دعوتی طریقہ میں نشانہ داخل میں۔

تشخص کا مسئلہ

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۲ مئی ۱۹۹۲) میں مسٹر وسنتھا پاتری (Vasantha R. Patri) کا ایک تجزیہ چھپا ہے۔ موضوع کے مطابق، اس کا عنوان ہے ــــــ لاس اینجلیز کے فسادات، افسانہ بکھر گیا :

Los Angeles riots: Myth lies shattered

یہ مضمون امریکہ کے نسلی فسادات کے بارہ میں ہے۔ اپریل۔ مئی ۱۹۹۲ میں یہ فسادات اولاً لاس اینجلیز میں ہوئے اور پھر کئی امریکی شہروں میں پھیل گئے۔ ان میں پچاس آدمی مر گئے۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ کروروں روپیہ کی جائداد تباہ ہوئی، آخر کار فوج نے آکر ان کو دبا دیا۔

۱۶۱۹ء میں امریکہ میں افریقہ کی سیاہ فام نسل کے لوگ بطور زرعی غلام کے لائے گئے تھے۔ یہ لوگ یہاں بس گئے۔ ان کی اولادیں ہوئیں، مگر امریکہ میں انھیں برابر کے شہری حقوق حاصل نہ ہو سکے۔ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر جو ایک تعلیم یافتہ نیگرو تھے، ان کی قیادت میں ۱۹۶۰ میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلی۔ اب اگرچہ قانونی طور پر امریکہ کی سیاہ فام نسل کو برابر کے شہری حقوق دیے گئے ہیں، مگر عملاً یہ حق انھیں حاصل نہیں۔ چنانچہ ان کے درمیان مسلسل بے چینی موجود رہتی ہے۔ اسی کا ایک شدید اظہار پچھلے فساد میں اس وقت ہوا جب کہ لاس اینجلیز کے ایک سفید فام ڈرائیور نے ایک سیاہ فام ڈرائیور کو سڑک پر مارا۔

مضمون نگار نے اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہندستان کے انتہا پسندوں کے لیے بھی بے حد قابل توجہ ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ امریکہ برابر یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر سیاہ فام نسل کو سفید فام نسل میں شامل کرے جس میں ہر آدمی سفید فام امریکی نقشہ میں ڈھل جائے۔ مگر حالیہ فساد نے اس نقطۂ نظر کی ناکامی کو ثابت کر دیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ تہذیبی تنوع کی حوصلہ افزائی کی جائے اور نسلی امتیاز کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہی دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند جمہوریت میں یک جہتی لانے کی واحد ضمانت ہے :

America has all along attempted a one-way assimilation, whereby everyone could be shaped into the Anglo-mould. From the latest manifestation of the failure of this approach a shift in emphasis can be considered. Encouraging cultural pluralism and active prevention of ethnic discrimination alone can ensure the integration of the world's richest democracy. (p.13)

مضمون نگار کا تبصرہ ہندستان کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا امریکہ کے لیے۔ اگرچہ دولت اور طاقت کے اعتبار سے دونوں ملکوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ تاہم جہاں تک مذکورہ مسائل کا تعلق ہے، وہ دونوں جگہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

ہندستان میں بھی ایک طبقہ ہے جو اسی ڈھنگ پر سوچتا ہے جس طرح امریکہ کے سفید فام لوگ سوچتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک خود ساختہ بھارتیہ ماڈل ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے تمام فرقے اور گروہ اسی ماڈل میں اپنے آپ کو ڈھال لیں۔ اس نقطۂ نظر کو کچھ لوگ بھارتیہ کرن کا نام دیتے ہیں اور کچھ لوگ اس کو انڈینائزیشن کہتے ہیں۔

مگر یہ ہندستان میں بھی اسی طرح ناقابل عمل ہے جس طرح وہ امریکہ میں ناقابل عمل ہے۔ اس قسم کے ہر نظریہ کا مطلب تاریخی حقیقتوں سے لڑنا ہے۔ اور تاریخی حقیقتوں سے لڑنا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانا اور پھر خود اپنا سر توڑ لینا۔

مضمون نگار نے بجا طور پر امریکی مسئلہ کا حل کلچرل پلورلزم کو بتایا ہے۔ یعنی ملک کے ہر تہذیبی گروہ کو اپنے تشخص پر قائم رہنے کا موقع دینا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا یہی ہندستان کے مسئلہ کا حل بھی ہے۔ ہندستان ایک بڑا ملک ہے۔ یہاں مختلف تہذیبی گروہ آباد ہیں۔ ان گروہوں کے تہذیبی تشخص کو مٹانے کی کوشش ملک میں فساد تو برپا کر سکتی ہے۔ مگر وہ خود تشخص کو ختم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ ہر ایک کے انفرادی تشخص کو تسلیم کیا جائے۔ ہندستان کو ایک باغ کی حیثیت دی جائے جہاں طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائی دے رہے ہوں نہ کہ صرف ایک پھول اور صرف ایک پودا۔ ہندستانی سماج کی کامیاب تشکیل صرف تنوع کے اصول پر ہو سکتی ہے، وہ یکسانیت کے اصول پر کبھی نہیں ہو سکتی۔

یہاں مصر کے مفتی الشیخ طنطاوی نے تذکیری انداز میں دیر تک کچھ باتیں کیں۔ اس میں خصوصی طور پر اسلام کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو واضح کیا۔ پھر انھیں نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھائی۔ آخر میں جزیرہ والوں کے لئے، مسلمانوں کے لئے اور اہل عالم کے لئے سلامتی اور فلاح کی دعائیں کی گئیں۔ یہ عمل تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔

اس نشست کے دوران سوال وجواب بھی ہوا۔ شیخ طنطاوی نے اپنی کانفرنس کی تقریر میں کہا تھا کہ اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی قتال ہے۔ اسلام میں ہجومی قتال نہیں ہے۔ جو لوگ جہاد کے نام پر غیر مسلم اقوام سے لڑائیاں چھیڑے ہوئے ہیں ان سے شیخ طنطاوی نے عدم اتفاق کا اظہار کیا۔

اس پر ایران کے عالم کو اعتراض تھا۔ انھوں نے شیخ طنطاوی سے سوالات کئے۔ شیخ طنطاوی نے نہایت عالمانہ انداز میں ہر سوال کا جواب دیا۔ ایرانی عالم نے یہ حدیث پیش کی کہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ۔ شیخ طنطاوی نے کہا کہ اس کا تعلق قدیم مشرکین عرب سے ہے جنھوں نے پیغمبر کا انکار کیا اور ان کو ان کے وطن سے نکالا۔ اب ہمارے لئے قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم کا حکم ہے۔ جو قومیں ہمارے خلاف عدوان نہ کریں ہم بھی ان کے خلاف جہاد نہیں چھیڑ سکتے۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم۔ مسلم حکومت کے تحت غیر مسلموں کے بارہ میں اسلام کا اصولی حکم انھوں نے یہ بتایا کہ لھم مالنا وعلیھم ماعلینا۔

مغرب کی نماز کے بعد ہمارا قافلہ دوسرے تعزات کے ساتھ ایک خاص مقام کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں کانفرنس کے شرکاء کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں مالٹا کے عوام جمع تھے۔ یہاں امن کے بارہ میں پوپ کا پیغام پڑھا گیا۔ ہر مذہب کے پیشواؤں نے امن کی شمع جلائی اور امن کے لئے دعائیں کی گئیں۔ پورا مجمع اس دعا میں شریک رہا۔

کانفرنس کی تھیم مذاہب امن کے سمندر کے لئے (Religions for a sea of peace) مقرر کی گئی تھی۔ یہاں عوام جس بڑی تعداد میں اور جوش وخروش کے ساتھ جمع ہوئے وہ گویا ایک "بحر امن" کا مظاہرہ تھا۔ کارروائی کے خاتمہ پر لوگوں نے آپس میں مل کر ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور مصافحہ کیا۔ اس موقع پر ان کا خاص کلمہ امن (peace). ہوتا تھا جس کو وہ اپنی زبان سے دہراتے تھے۔

یہاں سے ہم لوگ پیدل چل کر ایک بڑے میدان میں لے جائے گئے۔ یہاں مخصوص انداز میں عمومی اجتماع کا انتظام تھا۔ منتظمین اس کو "دعائیہ اجلاس" کہتے ہیں۔ اس دعائیہ اجلاس میں عوام اسی طرح بڑی تعداد امنڈ آئے تھے جس طرح تبلیغی جماعت کے جلسوں میں دعا کے وقت بستی کے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

غالباً ۱۹۴۲ میں پنڈت جواہر لال نہرو مئو (یوپی) آئے تھے۔ وہاں ان کا جلسہ تھا۔ میں بھی وہاں گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ میں نے کوئی بڑا جلسہ دیکھا۔ یہ بلا مبالغہ انسانوں کا جنگل تھا۔ بھیڑ کی اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

یہی احساس ۱۰ اکتوبر کے مذکورہ دعائیہ اجتماع میں بھی ہوا۔ تاہم یہ صرف بھیڑ نہ تھی بلکہ نہایت منظم اور نہایت منصوبہ بند قسم کا ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ اس کو دیکھ کر دوبارہ مجھے احساس ہوا کہ اس منظر کو اگر میں لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو میں اس کو الفاظ کی صورت میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کو یا تو براہ راست مشاہدہ کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے یا ٹی وی پر بالواسطہ مشاہدہ کے ذریعہ۔

اس طرح کے تجربات کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ جنت کی زندگی کے پر مسرت لمحات میں ایک لمحہ غالباً وہ بھی ہوگا جب کہ آدمی اپنے جنتی مکان میں "جنتی ٹی وی" پر پچھلے انبیاء کے واقعات کو دیکھے گا۔ پیغمبروں کی زندگی حیرت ناک واقعات کی زندگی ہے۔ ہم اس کو لفظوں کی صورت میں کتاب میں پڑھتے ہیں۔ مگر الفاظ ان کا پورا تعارف نہیں کرتے۔ جنت کا ایک آدمی اپنے "جنتی ٹی وی" کا بٹن دبا کر جب ان کو دیکھے گا تو وہ فرحت کا ایک ایسا تجربہ ہوگا جس کا آج کی دنیا میں اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

۹ اکتوبر کی سہ پہر کو میڈیٹیرینین سنٹر کے ایک ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ روم سے ۸۰ روزنامے نکلتے ہیں۔ ان میں سے بارہ اخباروں کے نمائندے پریس کانفرنس میں موجود تھے۔ جواب دینے والوں میں میرے سوا دو الجزائری مسلمان تھے اور ایک سوڈان کے اور ایک ایران کے عالم۔ سوالات اطالوی زبان میں کئے گئے۔ جن کا ترجمہ ایک مسیحی پادری نے عربی زبان میں کیا۔ سوالات زیادہ تر مسلم۔ مسیحی تعلقات کے بارہ میں تھے۔

پریس کانفرنس میں روم کے ایک اخباری نمائندہ نے سوال کیا کہ مسیحی لوگوں نے روم میں مسجد بنانے کی اجازت دے دی۔ پھر مسلمان مسیحیوں کو مکہ مدینہ میں چرچ بنانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔

الجزائر کے دکتور محمد السلیمانی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی مذہبی تعلیمات کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ اگر آپ کی انجیل میں یہ لکھا ہو کہ روم میں کسی غیر مذہب کا عبادت خانہ بنانے کی اجازت نہ دی جائے تو میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ وہ انجیل کے اس حکم کا احترام کریں اور روم میں ہرگز مسجد بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ہندستان میں اس طرح کے جواب پر مزید سوالات کا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ مگر یہاں سب کے سب اخبار نویس جواب کو سن کر چپ ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا سوال شروع کر دیا۔

ایک اخبار نویس نے سوال کیا کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان ڈائیلاگ کی کامیابی کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ کیوں کہ آپس کے اختلافات کی وجہ سے یہ کوشش آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ ایک جملہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کو نظر انداز کیجئے اور اتحاد کے گوشوں کی تلاش جاری رکھئے:

I will give the answer in a single sentence: avoid the differences and continue the dialogue to seek the points of agreement.

۹ اکتوبر کو شام کی نشست کا عنوان تھا: مذہب اور کلچر (Religion and Culture) بحیثیت چیرمین میں نے مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد مذکورہ موضوع پر لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

یہاں کے اجتماعات میں عورت اور مرد کثیر تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پڑھا لکھا ہوتا تھا۔ مگر میں نے کسی بھی اجتماع میں غیر ضروری سوال و جواب کا وہ انداز نہیں دیکھا جو ہندستان جیسے ملکوں میں عام ہے۔ یہاں تمام لوگ ذوق و شوق کے ساتھ اسٹیج کی تقریروں کو سنتے اور اس کے بعد یہ اصرار نہیں کرتے تھے کہ ہم کو ہر قسم کے سوال کرنے کا موقع دو۔

ہوٹل کے کمرہ میں حسب معمول گیڈینز (The Gideons International) کی طرف سے ہدیہ کی ہوئی بائبل بھی موجود تھی، ۱۸۹۸ میں امریکہ کے دو مسافروں نے طے کیا کہ وہ تمام دنیا کے ہوٹل، اسپتال وغیرہ میں بائبل (انجیل) کے نسخے مختلف زبانوں میں چھاپ کر فراہم کریں گے۔ اس وقت سے آج تک یہ کام جاری ہے۔ اس طرح عالمی پیمانے پر تمام دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچایا جا رہا

ہے۔ ۱۳۰ ملکوں میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔

موجودہ نسخہ تین زبانوں (اطالوی، فرانسیسی، انگریزی) میں تھا۔ دیباچہ میں انجیل کو خدا کی حیرت ناک کتاب (Wonderful Book of God) بتایا گیا تھا۔ اس میں درج تھا کہ گیڈینز بنیادی طور پر چرچ کا ایک غیر فرقہ وارانہ تبلیغی بازو ہیں۔ وہ خدا کے کلام کے قیمتی بیج کو تمام دنیا کی زمینوں میں بو رہے ہیں:

The Gideons are essentially a nonsectarian missionary arm of the church, sowing the precious Seed, the Word of God, in the field of the World.

مسلمان اپنی تقریروں اور تحریروں میں فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسیح کا پیغام صرف بنی اسرائیل کے لئے تھا اور اسلام کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ مسیحیت کو اس کے ماننے والوں نے ایک عالمی تبلیغی مذہب بنا دیا ہے۔ اور مسلمان کوئی ایک یا دوسری وجہ بتا کر اسلام کو عملاً صرف مسلمانوں کے لئے خاص کئے ہوئے ہیں۔ دعوت عام کا شعور مسلمانوں کے اکابر تک میں موجود نہیں۔

۸ اکتوبر کو دن کا ابتدائی نصف حصہ خالی تھا۔ ہم لوگ دو گاڑیوں پر مالٹا کا قدیم شہر دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ رہنما کے طور پر ڈاکٹر پنزا (Giancarlo Penza) موجود تھے۔ مالٹا کا قدیم شہر عربوں نے بسایا تھا۔ یہ آج بھی مدینہ (Mdina) کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کئی چیزیں دیکھیں۔

یہاں قدیم اشیاء کا ایک میوزیم ہے۔ اس میں بہت سی یادگار چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک ممتاز آرٹ ورک وہ ہے جس میں حضرت مسیح کو نعوذ باللہ سولی پر مردہ حالت میں دکھایا گیا ہے۔ صلیب کی شکل کی ایک لکڑی ہے۔ اس پر ایک دبلا اور ننگا انسان اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں کیلیں ٹھونکی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کا جسم مردہ کے انداز میں لٹک گیا ہے۔

واقعہ کے اعتبار سے اگرچہ وہ سراسر بے بنیاد ہے مگر خالص فنی اعتبار سے وہ نہایت کامیاب ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس دنیا میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سراسر خلاف واقعہ بات کو تصویر یا الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا جائے کہ عام انسان کو وہ بالکل حقیقی واقعہ نظر آنے لگے۔

مدینہ کے راستوں میں چلتے ہوئے ایک گلی کے کنارے ایک بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا (Tariq Mesquita) یعنی مسجد کا راستہ یا مسجد اسٹریٹ۔ اس گلی میں کافی تلاش کے باوجود کوئی مسجد نظر نہیں آئی، غالباً قدیم زمانہ میں یہاں کوئی مسجد تھی جس کے نام پر یہ گلی مسجد والی گلی مشہور ہو گئی۔ مگر اب وہ مسجد کسی مکان کا حصہ بن چکی ہے۔ اگرچہ گلی کا نام اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔

میرے ساتھی دکتور محمد السلیمانی الجزائری نے مالٹا کی ان چیزوں کو دیکھ کر کہا کہ طمسوا کل شیئ۔ یعنی مسیحیوں نے یہاں غلبہ پانے کے بعد تمام مسلم آثار کو مٹا دیا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ طمسنا کل شیئ یعنی ہم نے خود اپنی غفلت سے لوگوں کو یہ موقع دیا کہ وہ ہماری تمام چیزوں کو مٹا دیں۔

راستہ میں ہمارے ڈرائیور نے ایک جگہ بتایا کہ اس درخت کو مسیحی لوگ "شجرہ صلیب" کہتے ہیں۔ یعنی صلیبی درخت۔ کیوں کہ وہ بالکل صلیب کی شکل کا ہے۔ ہم نے اتر کر اس درخت کو بہت غور سے دیکھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس قسم کے توہمات ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ حتی کہ خود مسلمانوں میں بھی۔

اس کے بعد ہم ایک بڑی عمارت کے سامنے پہنچے۔ اس پر دار میوزیم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس میں پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے زمانہ کی بہت سی یادگار چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ حقیقی اور کچھ تصویر کی صورت میں۔ ایک جگہ یہاں کے گول چرچ کی تصویر تھی۔ اس کے پاس قدیم طرز کے ایک بم کی تصویر تھی جس کے پاس بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ تختی پر لکھا ہوا تھا کہ دوسری عالمی جنگ میں ۹ اپریل ۱۹۴۲ کو جرمنی نے یہ بم گول چرچ پر گرایا مگر وہ بم پھٹ نہ سکا:

During an air attack on 9th April 1942, a 500 Lb. bomb hit the Mosta Rotunda. It pierced the dome, bounced off the interior wall twice and skidded across the whole length of the Church without exploding. None of the congregation numbering over 300 was injured.

یہ دعوتی شعور کی کمی ہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب جس زمانہ میں مالٹا میں نظر بند تھے۔ ان کے حراستی عملہ کا انگریز افسران سے متاثر ہوگیا۔ کیوں کہ ان کے مشرقی انداز میں اس کو روحانی شخصیت کا حلیہ نظر آیا۔ یہ بہترین موقع تھا کہ اس انگریز کو اسلام کے قریب لایا جائے۔ مگر مولانا محمود حسن صاحب نے اس سے خلافت کے معاملہ میں انگریزوں کے نارواسلوک پر بحث چھیڑ دی جو ایک سیاسی اور اختلافی موضوع تھا۔ چنانچہ وہ انگریز مزید اسلام سے قریب نہ ہوسکا۔

مالٹا میں مولانا محمود حسن کے تین ساتھیوں میں سے ایک مولانا وحید احمد مدنی تھے۔ وہ ہندستان سے ہجرت کرکے عرب چلے گئے تھے۔ وہاں مولانا محمود حسن صاحب سے وابستہ ہوگئے اور پھر ان کے ساتھ گرفتار ہوکر مالٹا چلے گئے۔ مولانا موصوف کے صاحبزادے ڈاکٹر رشید الوحیدی دہلی میں ہیں اور مولانا فرید الوحیدی جدہ میں مقیم ہیں۔ مولانا وحید احمد مدنی کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ مختلف لوگوں سے تعلقات کے دوران انھوں نے کئی زبانیں سیکھ لیں ـــــ عربی، اردو، فارسی، انگریزی، ترکی، فرانسیسی، پشتو، بنگلہ وغیرہ۔ اگر ان کے اندر دعوتی اسپرٹ پیدا کی جاتی تو وہ کامیاب داعی بن سکتے تھے۔ مگر ان کی لیاقت غیر استعمال شدہ رہی۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۳۸ میں ۷۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

مالٹا کے مختلف حصوں میں مجھ کو بار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر ایک بار بھی کہیں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ جب کہ ہندستان کے شہروں میں ہارن کا شور عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہارن بجانا صرف ذہنی ڈسپلن کی کمی کا ثبوت ہے۔ حقیقی ضرورت سے اس کا تعلق بہت ہی کم ہے۔

اسی طرح مالٹا میں فٹ پاتھ کی دکانداری، سڑکوں کی گندگی، لاؤڈ اسپیکر کے ہنگامے، آپس کے لڑائی جھگڑے جیسی چیزیں کہیں نظر نہیں آئیں۔ انڈیا کا زمینی رقبہ ۱۲۶۹۴۲۰ مربع میل ہے، اور مالٹا کا رقبہ صرف ۱۲۲ مربع میل۔ انڈیا کے مقابلہ میں اس کے ذرائع تقریباً صفر کے بقدر ہیں۔ مگر مالٹا آج کی ترقی یافتہ دنیا کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔ جب کہ انڈیا ہر اعتبار سے ترقی یافتہ دنیا سے پیچھے ہے۔ حتی کہ مذہب اور اخلاق کے اعتبار سے بھی۔

انڈیا میں مقابلۃً نہ مادی ترقی نظر آتی اور نہ مذہبی ترقی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں مذہب کی بنیاد فرقہ وارانہ نفرت پر رکھی گئی اور قومی ترقی کی بنیاد سوشلزم کے غیر فطری اصول پر اور دونوں ہی چیزیں صرف فساد پیدا کرنے والی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اصلاح کرنے والی نہیں۔

جدید دنیا کے دوسرے شہروں کی مانند، مالٹا میں بھی گھر کی عورتیں باہر نکل آئی ہیں۔ مزید یہ کہ ہر عورت کی ٹانگیں کھلی ہوتی ہیں۔ ان حالات میں صرف غض بصر کافی نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ اعراض بصر کے اصول پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ عورت کی ٹانگ کا کھلا ہونا بلاشبہ ایک وحشت خیز منظر ہے۔ مگر جدید دنیا کے تمام مقامات پر اب یہ چیز بالکل عام ہو چکی ہے۔

پچھلے مہینہ میں لاہور گیا تھا۔ وہاں کوئی ایک عورت بھی کھلی ٹانگوں والی نظر نہیں آئی۔ اب روم اور مالٹا آیا تو یہاں ہر عورت اسی وحشت ناک حلیہ میں ہر طرف چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ تنزل کے باوجود اب بھی مسلمانوں کی زندگی میں ایسے بہت سے ممتاز پہلو ہیں جو غیر مسلم دنیا کو اسلام کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ عام مفروضہ کے برعکس، یہ نہیں ہے کہ لوگ مسلمانوں کی بے عملی کی بنا پر اسلام سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کے رہنما اسلام کے نام پر غیر مسلموں سے لفظی یا عملی لڑائی لڑنے میں مشغول ہیں۔ اس بے فائدہ لڑائی نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ضد اور نفرت کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی ضد اور نفرت کی فضا اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ مسلمانوں کی اخلاقی کمزوری۔ اگر

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قومی نفرت کی فضا ختم ہو جائے تو مسلمانوں کی موجودہ حالت کے باوجود اسلام تیزی سے ان کے درمیان پھیلنے لگے۔

موجودہ زمانہ میں مسیحی چرچ بہت بڑے پیمانے پر یہ کوشش کر رہا ہے کہ مسلمانوں اور مسیحی اقوام کے درمیان عداوت کی فضا ختم ہو جائے اور صلح و آشتی کی فضا قائم ہو جائے۔ موجودہ کانفرنس بھی اسی نوعیت کی ایک کوشش تھی۔ بہت سے مسلمان اس کو "مسیحی سازش" کہہ کر اس کو متوحش نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ دور جدید کی صلح حدیبیہ ہوگی جو بالآخر "فتح مبین" کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

یہاں مکۂ سیاحت کی طرف سے ہم کو تعارفی پمفلٹ اور کاغذات دیئے گئے تھے۔ یہ سب نہایت خوبصورت چھپے ہوئے تھے۔ اکثر کتابچوں کے صفحہ اول پر کسی نہ کسی گرجا یا مسیحی یادگار کی نمایاں تصویر دی گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ اسی مالٹا میں مسلم عمارتیں بھی ہیں، مگر ان کتابچوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ ایں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند کا معاملہ ہے۔ مالٹا کے بارہ میں ترک اگر کوئی پمفلٹ چھاپیں تو وہ اپنے دور کی مسجد کی تصویر صفحہ اول پر دیں گے۔ اسی طرح لیبیا والے اگر کوئی تعارفی پمفلٹ تیار کریں تو اس کے صفحہ اول پر لیبیا کے تعمیر کردہ اسلامی مرکز کی تصویر چھپی ہوئی ہوگی۔

یہی تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ ہندستان میں ہر ادارہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں سارا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے جیسے کہ وہی نظام عالم کی کلید ہے۔ اسی کے گرد کائنات کا کارخانہ گردش کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں دوسروں سے اس معاملہ کی شکایت کرنا غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مالٹا ایک خوبصورت مقام ہے۔ اس کو سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ ہم کو روزانہ بار بار شہر کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مگر بے شمار گاڑیوں کے باوجود یہاں کی فضا میں کثافت بہت کم تھی۔ صفائی کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ سڑکوں پر کہیں بھی کوئی چیز پڑی ہوئی نظر نہیں آئی۔ فٹ پاتھ کی بھیڑ اور گندگی کا نشان بھی کہیں موجود نہ تھا۔ قاعدہ اور قانون کی خلاف ورزی کا یہاں مزاج نہیں۔ ہر آدمی اپنی حد کے اندر رہ کر اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ میں نے ایک بار ایک مالی کو دیکھا۔ وہ ہوٹل کے

مالی گھاس دستی مشین کے ذریعہ کاٹ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مشغول اور منہمک تھا جیسے کہ اس کو اس کے سوا اور کسی چیز کی خبر ہی نہیں۔ جب کہ ہندستان کے "مالی" کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ دلچسپی دوسرے کام سے ہوتی ہے اور سب سے کم دلچسپی اپنی ڈیوٹی والے کام سے۔

۱۱ اکتوبر کو ہم مالٹا کے ایک قدیم چرچ میں داخل ہوئے۔ یہ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ اس وقت چرچ کے اندر سروس (عبادت) ہو رہی تھی۔ گیٹ کے پاس نوٹس بورڈ پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ WAQT IL-QUDDIES لکھے ہوئے تھے۔ غالباً اس کا مطلب وقت القدیس تھا۔

چرچ کے ہال میں چاروں طرف مجسمے لگے ہوئے تھے۔ ان میں دوسرے مسیحی پیشواؤں کے علاوہ مریم اور مسیح کا بھی مجسمہ تھا۔ اسٹیج کے مقام پر چند پادری کچھ پڑھ رہے تھے اور بار بار جھک کر اپنا سر میز پر رکھتے تھے۔ حاضرین سامنے کی بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مسیحی عبادت (اور اسی طرح دوسرے مذاہب) کی عبادت کا طریقہ انسان کی روح کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ انسان عین فطرت کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق کے آگے پوری طرح ڈال دے۔ اور ان طریقوں میں انسان صرف جزئی طور پر اپنے آپ کو اپنے خالق کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ پوری طرح اپنے آپ کو خدا کے حوالے نہیں کر پاتا۔

۱۰ اکتوبر کو شام کے کھانے کے لئے ہم لوگوں کو ایک مقام پر پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ "بشپ پیلس" ہے۔ یہ بہت بڑا محل کی مانند ایک مکان تھا۔ تاہم وہ بالکل سادہ تھا۔ یہ یہاں کے بشپ کی قیام گاہ ہے۔ یہاں لوگوں نے مالٹا کے مخصوص انداز میں کھانا کھایا۔ ملاقاتیں کیں اور پھر واپسی ہوئی۔

مالٹا کے انگریزی اخبار دی ٹائمس (۸ اکتوبر ۱۹۹۱) میں یہ خبر تھی کہ یہاں کے سابق پولیس کمشنر کمنڈیٹور بنسینی (commedatore Algred J. Bencini) کا ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۹۳۹ میں مالٹا پولیس فورس میں شامل ہوئے تھے۔

کمنڈیٹور بنسینی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی ہے جو ــــ سچائی کے سوا اور کچھ نہیں

(Nothing But the Truth) کے نام سے چھپی ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء میں ریٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ پانچ مہینہ تک انتظام میں وزیر اعظم کی غیر قانونی مداخلت کے بعد میں پنشن لے کر ملازمت سے الگ ہو گیا تھا:

... he had retired on pension in January 1973 after five months on protest leave against Prime Minister Dona Mintoff's illegal interference in the internal administration of the force.

کسی نظام میں جب آدمی کی پوزیشن وہ ہو جائے جو مسٹر بنسینی کی ہو گئی تھی تو اس وقت مسئلہ خارجی نظام کا نہیں رہتا بلکہ خود اپنے ضمیر کا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کرنا چاہئے۔ اس کے بعد نہ مصالحت درست ہے اور نہ بے فائدہ طور پر نظام سے ٹکرانا۔

۱۱ اکتوبر کی صبح کو مالٹا سے میری واپسی تھی۔ اپنے کمرہ میں فجر کی نماز کے لئے کھڑا ہوا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں حدیث کے الفاظ میں "صلاۃ مودع" پڑھ رہا ہوں۔ گویا کہ آج کا دن مالٹا سے نہیں بلکہ خود دنیا سے میری روانگی کا دن ہے جہاں خالق کائنات نے مجھ کو ایک مدت کے لئے بھیجا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آخری روانگی کا دن میرے لئے آج مقدر ہے یا آج کے بعد۔ تاہم اس وقت کو آنا ہے اور وہ ضرور آکر رہے گا۔ اس کے بعد کس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واللہ لا ادری واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم۔

"آخری لمحات" کے احساس کے تحت کلمۂ شہادت میری زبان پر آگیا۔ میں نے کہا: اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ اس کلمہ کو ادا کرتے ہوئے مزید یہ احساس ابھرا کہ بہت سے نادان لوگ اس کلمہ کو کلمۂ فخر سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت وہ کلمۂ عجز ہے۔ یہ خدا کی خدائی یا رسول کی رسالت کا صرف اقرار نہیں بلکہ اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف بھی ہے۔ گویا ایک بندہ جب اس کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا تو خدا ہے، میں خدا نہیں ہوں۔ اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، مجھے رسول کی حیثیت حاصل نہیں۔ توحید و رسالت کے اقرار کے ساتھ اپنی عبدیت کا یہ اعتراف جب تک اس میں شامل

نہ ہو اس کو پورے معنوں میں کلمۂ شہادت کی ادائگی نہیں کہا جاسکتا۔

۱۱ اکتوبر کی دوپہر کو ہم واپس ہو کر دوبارہ مالٹا ایئرپورٹ پہنچے۔ یہاں کچھ وقت ڈی آئی پی لاؤنج میں گزرا۔ ضروری اندراجات کا سارا کام ہمارے میزبان نے کیا۔ ساڑھے بارہ بجے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے نکلا۔ یہ ایئر مالٹا کی فلائٹ (KM 220) تھی۔ جہاز کے دروازہ پر پہنچا تو وہاں دروازہ کے کنارے حسب ذیل دو لفظ لکھے ہوئے تھے۔ (Iftah/Open) ہوائی جہاز کے اسٹاف کے ایک آدمی سے میں نے پوچھا کہ "افتح" کیا مالطی زبان ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ مالطی زبان بہت زیادہ عربی زبان سے مشابہ ہے:

Malti language is very similar to Arabic language.

جہاز کے مسافروں میں زیادہ تعداد سیاحوں کی تھی۔ مالٹا میں سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ مالٹا کی آمدنی کا خاص ذریعہ سیاحت ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندستان کو سیاحت انڈسٹری کا بہت کم حصہ ملتا ہے۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سیاح یہاں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ مختلف قسم کی پرتشدد تحریکوں نے سیاح کو ہندستان کی طرف سے متوحش بنا دیا ہے۔

دوسری اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ ہندستان کا نظام سیاحوں کے لئے اسی طرح غیر ہمدرد ہوتا ہے جس طرح وہ عام ہندستانیوں کے لئے غیر ہمدرد ہے۔ سیاح اکثر ہندستان سے تلخ دفتری اور انتظامی تجربات لے کر واپس لوٹتے ہیں۔ جہاز کے اندر ایئر مالٹا کی فلائٹ میگزین (Melta)، کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ میں ایک مضمون مالٹا میں ٹیلی کارڈ کو رائج کرنے کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فائر، پولیس اور ایمبولنس جیسے ایمرجنسی نمبروں کو ڈائل کرنے کے لئے کوئی رقم ادا کرنے کی ضرورت نہیں:

One does not need to insert a card to dial the emergency numbers

مذکورہ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مالٹا میں سیاحوں کے لئے بہت سی رعایتیں ہیں۔ مذکورہ رعایت ان میں سے صرف ایک ہے۔

ہمارا جہاز ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا مالٹا سے قاہرہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ہم جزیرہ کریٹ (Crete) سے گزرے۔ کریٹ کو دیکھ کر ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔

عرب ۸۲۴ء میں کریٹ کے ساحل پر اتر چکے تھے اور انھوں نے اس کے ایک حصہ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ ۱۶۶۹ میں ترکوں نے پورے کریٹ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ میڈیٹرینن کا یہ جزیرہ ایک عرصہ تک ترکوں کی یورپ میں پیش قدمی کے لئے ان کا بحری اڈہ بنا رہا۔ ۱۸۹۸ میں ترکوں کو کریٹ چھوڑ دینا پڑا۔ (5/253)

میں نے سوچا کہ "کریٹ" ایک اعتبار سے مسلم تاریخ کا ایک صفحہ ہے، ایک ایسی تاریخ جو اب گزر چکی۔ اگر میں صرف اس تاریخ کو یاد کروں تو اس سے مجھے حسرت اور افسوس کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔ مگر دوسرے اعتبار سے "کریٹ" ایک جزیرہ ہے جو میڈیٹرینن کے درمیان ابھرا ہوا ہے۔ وہ قدرت کا ایک نشان ہے جو بتاتا ہے کہ کس طرح خدا نے وسیع سمندروں میں جگہ جگہ خشکی کے مقامات پیدا کر دئے ہیں جہاں انسان اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ "کریٹ" کو اگر میں اس دوسرے پہلو سے دیکھوں تو آج بھی وہ مجھ کو اپنا نظر آئے گا۔ کیوں کہ وہ مجھ کو عظیم ربانی خوراک دینے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

ہم نے ایئر مالٹا کے جس جہاز سے سفر کیا، اسی سے مالٹا کے پرائم منسٹر ایڈورڈ فرنچ ادامی (Edward French-Adami) بھی سفر کر رہے تھے۔ مگر جہاز میں پرائم منسٹر کے لئے کوئی اہتمام نہ تھا۔ نہ سیکورٹی کا کوئی آدمی دکھائی دیا۔ انڈیا کا پرائم منسٹر اولاً تو عام جہاز (کمرشیل فلائٹ) میں سفر نہیں کرے گا۔ اور اگر بالفرض وہ ایسا کرے تو جہاز میں اس کے لئے اتنی دھوم ہوگی کہ ہر آدمی محسوس کرے گا کہ پرائم منسٹر صاحب اس جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ ہندستان میں "پرائم منسٹر" کے لئے کچھ اور ہے اور عوام کے لئے کچھ اور۔ اس کے برعکس مالٹا میں جو عوام کے لئے ہے وہی پرائم منسٹر کے لئے بھی ہے۔ پرائم منسٹر کو انتظامی اختیارات یقیناً عوام سے زیادہ حاصل ہیں۔ مگر حقوق اور احترام میں دونوں کے درمیان کوئی امتیازی فرق نہیں۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر مصر کے ایک عیسائی جارج اناوتی (George Anavati) تھے۔ وہ اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ۵۰ سال سے قاہرہ میں رہتے ہیں۔ ان سے مصر کے عیسائیوں کے بارہ میں بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ مصر میں ۱۰ فیصد مسیحی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ مسیحیوں کا کلچر اور مسلمانوں کا کلچر ایک ہے یا دو ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مذہب اور ان کا مذہب تو الگ الگ ہے۔ باقی کلچر دونوں کا ایک ہے۔ کلچر کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے ان کی عمر پوچھی۔

انھوں نے بتایا کہ ۸۶ سال۔ میں نے کہا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ ۸۶ سال میں اتنی اچھی حالت میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الحمدللہ۔

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔ دو مسلم گروہ بھی اگر کلچر میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو ان کے درمیان معتدل تعلقات مشکل ہو جائیں گے۔ اس کی مثال سابق پاکستان میں بنگالی اور پنجابی تعلقات اور موجودہ پاکستان میں سندھی اور مہاجر تعلقات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہندستان کے مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ اکثریتی فرقہ سے الگ اپنا کلچرل تشخص قائم کریں۔ اصولاً یہ کوئی غلط بات نہیں۔ مگر ہم کو جاننا چاہئے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے اور کسی مشترک سماج میں علیحدہ تشخص قائم کرنے کی بھی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں قیمت دئے بغیر کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی۔ سندھ کے مہاجرین نے اپنا علیحدہ گروہی تشخص قائم کرنا چاہا مگر وہ اس کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ہر ایک کو معلوم ہے۔

جو سوال میں نے جارج اناواتی سے پوچھا تھا۔ وہی سوال میں نے قاہرہ میں محمد کمال صاحب سے کیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہاں کلچر کے اعتبار سے مسلمان اور مسیحی میں فرق ہے۔ اگر ہم ایک مسیحی سے سڑک پر ملیں اور اس سے بات کریں یا اس کے ساتھ چل کر اس کے گھر میں داخل ہوں تو کیا ہم اس کی زبان اور رہائش میں اور مسلمان مصری کی زبان اور رہائش میں فرق محسوس کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ نہیں، کوئی فرق نہیں۔ سوا اس کے کہ ہم مسجد میں جاتے ہیں اور وہ چرچ میں جاتے ہیں۔ اس کے سوا دونوں میں کوئی فرق نہیں (لیس هناك اي فرق)

کولمبس ایک اطالوی ملاح تھا جس نے مشہور روایت کے مطابق امریکہ کو دریافت کیا۔ اس کی کشتیوں کا بیڑا ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کو امریکہ (Bahamas) کے ساحل پر پہنچا تھا۔ اس اعتبار سے اس واقعہ پر اب پانچ سو سال گزر چکے ہیں۔

الیتالیا کے اشاعتی شعبہ نے اس مناسبت سے ۱۳۰ صفحات کا خصوصی نمبر (Colombo 92) شائع کیا ہے۔ اس میں کولمبس کو عالمی اطالوی (Universal Italian) کا لقب دیا گیا ہے۔ ایک مضمون (The Dawn of Modern Age) کے تحت بتایا گیا ہے کہ ۵۰۰ سال پہلے کولمبس کی دریافت امریکہ کے ذریعہ ایک نئے جغرافی، علمی، اخلاقی اور رفاہی کا راستہ کھولا گیا:

5000 years ago the way was opened to new geographic, scientific, ethical and juridical horizons (p.10)

خالص تاریخی اعتبار سے اصل حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید کی صبح اسلام کے ظہور کے وقت چودہ سو سال پہلے طلوع ہوئی۔ یہ دراصل توحید پر مبنی اسلامی انقلاب تھا جس نے انسان کے اوپر تمام جدید ترقیوں کے دروازے کھولے (تفصیل کے لئے: اسلام دورِ جدید کا خالق)

ایک مسلمان پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے عربوں کے بارہ میں یہ شکایت کی کہ وہ یورپ اور امریکہ کے سفید فام لوگوں سے بہت مرعوب ہیں۔ یہاں کی ایک اصطلاح ہے جس کو عُقدۃ الخَوَاجَہ (White man Complex) کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اس مرعوبیت کو بتاتا ہے جو موجودہ عربوں کو سفید فام امریکنوں یا یورپینوں کے بارہ میں ان کے اندر ہے۔ ایئرپورٹ پر سفید فام امریکی کو "ویلکم" کے ساتھ مسکراہٹ ملے گی۔ مگر ہندستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی مسلمان کا استقبال صرف خشک دفتریت سے کیا جائے گا۔ یہی فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ حتی کہ تنخواہوں میں بھی دونوں طبقوں کے درمیان واضح امتیاز موجود ہے۔

تاہم مجھے ذاتی طور پر اس کی شکایت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا تفریقی سلوک حقیقۃً سفید فام یا سیاہ فام کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ قومی امیج کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ "سفید فام امریکی" نے اپنے تین سو سالہ عمل سے اپنی ایک اعلیٰ عمومی امیج بنائی ہے۔ بدقسمتی سے ایشیائی اور افریقی مسلمان اپنے حق میں اس قسم کی امیج نہ بنا سکے۔ ایسی حالت میں ناممکن ہے کہ ہماری کوتاہی کی قیمت کوئی دوسرا ادا کرے۔

مادی اور ٹکنکل ترقیات کے علاوہ عام اصول حیات میں بھی ایشیائی اور افریقی مسلمان ان سفید فام قوموں سے پیچھے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ اپنا کام حد درجہ پلاننگ کے ساتھ کرتے ہیں جب کہ ہمارے یہاں ابھی تک تصور کے درجہ میں بھی پلاننگ کا کوئی وجود نہیں۔ ایسی حالت میں اگر بین اقوامی سلوک میں دونوں کے درمیان فرق پایا جائے تو یہ عین مطابق حقیقت بات ہے۔ ہمیں چاہئے کہ خود اپنی کوتاہیوں کو دور کریں نہ کہ دوسروں کے خلاف احتجاج کرنے میں اپنا وقت ضائع کریں۔

قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر جہاز اترا تو مسافروں نے تالیاں بجائیں۔ ہوائی جہاز جب فضا

میں بلند ہو کر اڑ رہا ہو تو اس میں حادثہ کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہوائی حادثے ہوائی اڈہ سے اڑتے ہوئے یا ہوائی اڈہ پر اترتے ہوئے پیش آتے ہیں۔ اس لئے ہوائی جہاز کا محفوظ طور ہوائی اڈہ پر اتر جانا مسافروں کے لئے خصوصی اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔

جہاز سے اتر کر ہوائی اڈہ کی عمارت کے سامنے پہنچا تو داخل ہونے کے دروازہ پر ایک بورڈ تھا اس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد قرآن (یوسف ۹۹) کی یہ آیت روشن حروف میں لکھی ہوئی تھی :

ادخلوا مصر ان شاء اللہ آمنین۔ اندر ایمگریشن کی قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں شیخ اسحاق ادریس مجھ کو دیکھ کر وہاں آ گئے۔ انھوں نے میرا اور میرے ساتھی کا پاسپورٹ لے کر اسٹاف کے ایک آدمی کو دیا اور ہم کو لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ضروری کارروائی مکمل ہو کر ہمارا پاسپورٹ واپس آ گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور دل سے دعا نکلی کہ کاش قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ میرے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمائے۔

ہوائی اڈہ کے باہر میرے میزبان محمد کمال مصری موجود تھے۔ ان کے ساتھ شہر کے لئے روانہ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھا تو محمد کمال صاحب نے کہا : شرفت القاهرة یا مولانا۔ اس وقت میں ایک خیال میں گم تھا۔ میری زبان سے نکل گیا : نعم۔ ایک لمحہ کے بعد خیال آیا کہ میں نے بڑا غلط لفظ کہہ دیا۔ مجھے کہنا چاہئے تھا : بل القاهرة شرفتنی۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کان سے نہیں سنتا، وہ دماغ سے سنتا ہے۔ آدمی کسی کی بات سنے یا کسی کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جائے تو صرف لفظ کو نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس سے اس کی واقعی مراد کیا ہے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنه

قاہرہ کے در و دیوار گویا کتاب واقعات کے زندہ اوراق ہیں۔ یہاں کے ہر حصہ سے تاریخ کے واقعات وابستہ ہیں۔ ہم شہر کے لئے روانہ ہوئے تو میرے میزبان نے سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی عمارتوں کا تعارف کرانا شروع کیا ـــــ یہاں انور سادات کو گولی ماری گئی۔ یہ صلاح الدین کا قلعہ ہے۔ یہ جامعۃ الازہر ہے۔ یہ فاطمیوں کے عہد کی یادگار ہے۔ وغیرہ۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا گویا ہم سڑک پر نہیں چل رہے ہیں بلکہ تاریخ کے درمیان اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔

شیخ اسحاق ادریس بھی ہمارے ساتھ آئے۔ ایک مقام پر پہنچ کر گاڑی رکی۔ یہ دس منزل

منزلہ مکان تھا جس کی آخری منزل پر موصوف کا قیام ہے۔ ہم گاڑی سے باہر آئے تو سامنے پھلوں کی دکان تھی جو مذکورہ مکان کی زمینی منزل پر واقع ہے۔ ہم لوگ کل چار آدمی تھے۔ دکاندار فوراً اپنی دکان سے اسٹے اور کیلے چھیل چھیل کر ہر ایک کو پیش کرنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ یہ عرب اخلاق کا پہلا نمونہ ہے جس کا تجربہ یہاں پہنچ کر ہم کو ہو رہا ہے۔ کچھ وقت شیخ اسحاق ادریس سوڈانی کے مکان پر گزارنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔

رات کو عشاء کے وقت ہم اپنی قیام گاہ (زہرا حلوان) پہنچے۔ یہ دکتور عبد الحلیم عویس کا مکان ہے۔ انھیں کی دعوت اور اصرار پر مصر کا یہ سفر پیش آیا۔ وہ ریاض کی جامعۃ الامام میں علوم اجتماعی کے شعبہ میں استاد ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ابن خلدون ۱۳۸۲ء میں قاہرہ آیا تھا۔ اس وقت بحری راستہ کے ذریعہ تیونس سے اسکندریہ (مصر) پہنچنے میں ابن خلدون کو چالیس دن لگے۔ چند روز اسکندریہ ٹھہر کر وہ قاہرہ پہنچا۔ آج مواصلات کی ترقی نے سفر کی مدت کو کتنا زیادہ گھٹا دیا ہے۔ یہ مواصلاتی ترقیاں شاید اسی لئے ہیں کہ لوگوں کو اہل جنت کے سفروں کا تعارف کرایا جائے جو زمین و آسمان کی وسعتوں میں بلا خوف تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہے گا (آل عمران ۱۳۳)

اگرچہ قاہرہ کی تاریخ پانچ ہزار سال تک جاتی ہے۔ مگر موجودہ شہر صحابی رسول عمرو بن العاص نے ۶۴۱ء میں بسایا۔ اس وقت اس کا نام الفسطاط تھا۔ اسی سال انھوں نے مصر کی پہلی مسجد اسی شہر میں بنائی جو اب بھی مسجد عمرو بن العاص کے نام سے مشہور ہے۔ ۹۷۴ء میں شہر کی نئی تعمیر ہوئی۔ اس وقت سے اس کا نام القاہرہ ہے۔

۱۷۹۸ء میں جب نپولین قاہرہ میں داخل ہوا اس وقت شہر کی آبادی تین لاکھ (300,000) سے کم تھی۔ آج قاہرہ کی آبادی تقریباً ۸۰ لاکھ ہو چکی ہے۔

"دار الصحوۃ" کو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کو دکتور عبد الحلیم عویس (جامعۃ الامام ریاض) نے ۱۹۸۴ میں قاہرہ میں قائم کیا۔ اس کے موجودہ انچارج محمد کمال عبد رب النبی ہیں۔ محمد کمال صاحب میں واقعی کمال کے اوصاف ہیں۔ قاہرہ میں دکتور عبد الحلیم عویس اور محمد کمال عبد رب النبی کے خصوصی تعاون کی وجہ سے ہم کو بہت آسانی ہوئی۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱ آل انڈیا ریڈیو (نیشنل چینل) سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۱۷ جون ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔ یہ "فکر مشرق" کے مستقل پروگرام کے تحت تھی اور اس کا عنوان تھا: مولانا روم ــــ ایک تعارف

۲ مدراس کے ایک تعلیم یافتہ کرسچین ڈاکٹر وتم پوری جان ایڈوکیٹ تقابل مذہب پر مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اسلام کے بارہ میں ان کے کچھ سوالات تھے۔ اس سلسلہ میں وہ ۷ اگست ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز سے ملے اور اپنے سوالات کے جوابات معلوم کئے۔ اللہ کے فضل سے وہ مطمئن ہوگئے۔

۳ گودھرا کے اقبال حسین غلام نبی صاحب نے مطلع کیا ہے کہ وہ الرسالہ کے مضامین کا ترجمہ گجراتی زبان میں کر رہے ہیں۔ اور ان کو گجراتی اخبارات میں شائع کر رہے ہیں۔

۴ اخبار نئی دنیا کے نمائندہ جناب صالح عبداللہ صاحب نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا موضوع بابری مسجد ــ رام جنم بھومی کا مسئلہ تھا۔ یہ انٹرویو نئی دنیا کے شمارہ ۷ ــ ۱۳ اگست ۱۹۹۲ میں شائع ہوا ہے۔

۵ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ ایک پرچہ نہیں بلکہ دین اسلام کی تبلیغ کا ایک شاندار ذریعہ ہے۔ آپ کی حیثیت ایک مبلغ کی ہے جو زمانہ حاضر میں قرآن کی روشنی میں زندگی کے پہلوؤں کو اجاگر کر کے صاف ستھرے اسلام کو لوگوں کے روبرو پیش کر رہا ہے (مسعود ادیب، ارتام)

۶ ایک خاتون لکھتی ہیں: کچھ عرصہ سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ پرانے شمارے جتنے مل سکے جمع کئے ہیں اور بڑی بے صبری سے ان کو ختم کر رہی ہوں۔ اس تشنہ روح کو برسوں سے جس چیز کی تلاش تھی وہ راستہ آپ نے دکھایا ہے۔ آپ نے اسلام کا صحیح مزاج سمجھ کر جس انداز میں مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے وہ قابل قدر ہے۔ آپ کے مضامین پڑھ کر روح کو عجیب سکون محسوس ہوتا ہے۔ دل میں گھر کر جاتی ہیں آپ کی باتیں۔ اس مشن کو پورا کرنے کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے ضرور کروں گی۔ پانچ پرچہ کی ایجنسی بھی چلانے کی کوشش کر رہی ہوں (ڈاکٹر انیس فاطمہ، جالنہ)

۷ نمبر ۱ نظام الدین ویسٹ مارکٹ (نئی دہلی) میں الرسالہ بک سنٹر کے نام سے ایک کتابی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ یہاں الرسالہ مطبوعات کے علاوہ مختلف ملکی اور غیر ملکی اداروں کی چھپی ہوئی اسلامی کتابیں فراہم کرنے کا انتظام ہے۔ یہاں سے اردو، عربی، انگریزی، ہندی زبانوں میں اسلامی کتابیں دستیاب ہیں

اللہ کے فضل سے الرسالہ کا مشن روز بروز پھیل رہا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس سے متاثر افراد اسی انداز پر پرچے نکال رہے ہیں یا اسی انداز میں کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مولانا عبدالرؤف گلاب (سرینگر، کشمیر) ہیں۔ انھوں نے جنت اور اہل جنت، اور جہنم اور اہل جہنم کے نام سے کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں میں انذار و تبشیر کے انداز میں دعوت کو پیش کیا گیا ہے۔

کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ وہ تین الگ الگ کتاب کی صورت میں تین جلدوں میں شائع ہوگا۔ پہلی جلد انبیاء سابقین کے بارہ میں۔ دوسری جلد پیغمبر آخر الزماں کے بارہ میں اور تیسری جلد صحابہ کرام رض کے بارہ میں۔

ایک صاحب لکھتے ہیں: میں گزشتہ سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اور مسلسل استفادہ حاصل کر رہا ہوں۔ اور بلاشبہ یہ موجودہ تنزل کے دور میں نہایت عمدہ اقدام ہے۔ اس کا قاری اسے پڑھ کر اپنی بیتی ہوئی زندگی کا محاسبہ کرتا ہے کہ اس سے کیا صحیح اور کیا غلط اقدامات سرزد ہوئے۔ اور میں نے خود بہت سے نازک مواقع پر مثبت اقدامات اور طرز فکر کو ترجیح دی ہے (محمد طیب خاں، رامپور)

الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ پڑھ کر تسلی نہیں آتی ہے۔ ایک پرچہ وصول کر کے دوسرے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ الرسالہ ایک سدا بہار تحریری غذا ہے۔ لوگوں کو اس سے لاکھ اختلاف سہی، مگر اس رسالہ کی افادیت سے انکار تاریخ کی بدترین غلطی ہوگی۔ انشاء اللہ آئندہ مفصل لکھوں گا۔ (غلام حسن، گروسر)

ایک صاحب لکھتے ہیں: اتفاقاً آپ کا رسالہ الرسالہ (دسمبر ۱۹۹۱) میں نے پڑھا۔ نہایت خوبصورت اور بہت اچھا ہے۔ اس کی تعریف لفظوں میں نہیں کی جا سکتی۔ اس کو پڑھ کر دل کو بہت سکون اور اطمینان ملا۔ اس کو پڑھ کا دل کا کمل کھل اٹھا ہے۔ آپ نے حدیث اور دین و دنیا پر بہت اچھی معلومات دی ہیں۔ کاش مجھے اس کے بارے میں پہلے سے معلوم ہوتا۔ اس میں آدمی کی زندگی بدل ڈالنے کی طاقت ہے (نثار احمد خاں، بلڈانہ)

۱۳ "علماء کا رول" نامی ایک کتابچہ تیار ہوا ہے۔ وہ انشاء اللہ الرسالہ میں بطور ضمیمہ شائع کیا جائے گا۔ اس میں تنقیدی جائزہ بھی ہے اور علماء کے صحیح رول کی نشاندہی بھی۔

۱۴ مسٹر ایس شفیع احمد (Cuddapah 516001) اپنے خط میں لکھتے ہیں :

I happened to go through your much esteemed monthly magazine *Al-Risala* and I finished its reading in one sitting as the contents therein were so thought provoking and enlightening that my words are too poor to express my deep appreciation for the unforgettable services being rendered by a great reformer like you in bringing about healthy transformation in the attitude and outlook of the Muslim community which seems to have lost a clear sense of direction and vision of their future in the face of rapidly changing global situation.

۱۵ ۱۷ اگست ۱۹۹۲ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سیمینار تھا۔ اس سیمینار کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا عنوان تھا : امپروونگ ہندو مسلم ریلیشنز (Improving Hindu-Muslim relations) اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہر آدمی اپنی فطرت کے اعتبار سے انسانیت دوست اور امن پسند ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کو ان کی فطرت پر رہنے دیا جائے تو عام حالات میں وہ اچھی طرح ہی رہیں گے۔ انسانی تعلقات میں بگاڑ فطرت سے ہٹنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے اچھا سماج بنانے کے لیے ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ بگاڑنے والے عنصر کو ہٹا کر یہ موقع پیدا کر دیں کہ لوگ اپنی اصل فطرت پر زندگی گزارنے لگیں۔

۱۶ کلکتہ سے مسز نذیر لکھتی ہیں : مجھے الرسالہ کا ایک پرانا پرچہ ملا۔ پڑھ کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ اس کے بعد رسالہ کی خریدار بن گئی۔ اور ساتھ ساتھ اپنی بیٹی رفعت جاوید کے نام سے رسالہ جاری کروا دیا۔ الرسالہ حقیقت تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بتاتا ہے وہ حق کی پہچان کراتا ہے اور انسانوں کا بھلا چاہتا ہے۔ اس کی سادہ اور صاف تحریر دل میں اُتر جاتی ہے۔ اس رسالے میں قرآن و حدیث دنیا و آخرت کی حقیقتیں سبق آموز واقعات اور با اصول زندگی گزارنے کے بہترین نسخے ہیں۔ اس کے مضمون اپنے درس میں خواتین کو سناتی ہوں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۲ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۳۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃 〃	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

ایک ملّی ضرورت

مجھے اکثر یہ تجربہ پیش آتا ہے کہ میری ملاقات ایسے مسلمانوں سے ہوتی ہے جو تعمیری باتیں کرتے ہیں، جو مثبت سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ پورے معنی میں انسانیت دوست ہیں، ان کو کسی بھی طرح تنگ نظر یا فرقہ پرست نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری طرف جب مجھے یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ برادرانِ وطن کے احساسات مسلمانوں کے بارے میں کیا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں مسلمانوں کی جو تصویر بنی ہے وہ بالکل منفی تصویر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس ملک کا اثاثہ نہیں۔ مسلمان اس ملک کے لیے صرف بوجھ ہیں۔ وہ اس ملک میں دینے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ صرف مانگنے والے لوگ ہیں۔ ان کی سیاست احتجاجی سیاست ہے۔ حقوق طلبی کے سوا کوئی اور زبان انھیں معلوم نہیں۔

داخلی حالت اور بیرونی تصویر میں یہ فرق کیوں ہے۔ اگرچہ مسلمانوں میں کثرت سے صحت مند ذہن کے لوگ ہیں، اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ ملک میں مسلمانوں کی تصویر صحت مند تصویر نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اخباروں کے صفحات میں اور جلسوں اور تقریروں میں ایسے مسلمان نمایاں ہو رہے ہیں جو ملت کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔

موجودہ زمانہ پریس کا زمانہ ہے۔ لوگ اپنے شہر کی بات کو بھی اخباروں میں پڑھ کر جانتے ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں بھی عام لوگوں کو اتنی ہی بات معلوم ہے جو اخباروں میں چھپتی ہے۔ بدقسمتی سے اخبارات میں مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کی نمائندگی کے اہل نہیں۔ ان کی سوچ منفی سوچ ہے۔ اس لیے ان کی نمائندگی بھی منفی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کی تصویر عمومی طور پر ایک غیر واقعی تصویر بن گئی ہے۔

ایسی حالت میں ایک اہم ملّی ضرورت یہ ہے کہ صحت مند سوچ رکھنے والے مسلمانوں کا ایک فورم بنایا جائے۔ یہ فورم ہر موقع پر سامنے آئے۔ وہ شکایتی زبان کو چھوڑ کر تعمیری زبان بولے۔ وہ جذباتی انداز کلام کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز کلام اختیار کرے۔ میڈیا میں اگر اس قسم کے ایک فورم کی طرف سے مسلمانوں کی نمائندگی ہونے لگے تو ملت کی بگڑی ہوئی تصویر اپنے آپ درست ہو جائے گی۔

اجتماع

پچھلے اعلان کے مطابق، الرسالہ مشن اور اسلامی مرکز کے مقصد سے اتفاق رکھنے والوں کا دوسرا کل ہند اجتماع انشاء اللہ ہندستان کے تاریخی شہر بھوپال (مدھیہ پردیش) میں ہوگا۔ انشاء اللہ اس میں صدر اسلامی مرکز شرکت کریں گے۔ اور مشن سے تعلق رکھنے والے دوسرے اکثر اشخاص شریک ہوں گے۔

اجتماع کی کارروائی انشاء اللہ بھوپال کی مشہور مسجد صوفیہ میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۲ کو بروز جمعرات دوپہر کے وقت شروع ہوگی۔ اور ۲۴ اکتوبر بروز سنیچر نماز ظہر کے بعد ختم ہو جائے گی۔ شرکاء حضرات براہ کرم ۲۲ اکتوبر کو دوپہر سے پہلے صوفیہ مسجد (بھوپال) میں پہنچ جائیں۔

اس سلسلہ میں انفرادی دعوت نامے جاری نہیں کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ الرسالہ مشن سے وابستہ ہیں اور اس سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اس اعلان کو کافی سمجھیں اور مقرر وقت پر بھوپال پہنچنے کی کوشش کریں۔ صوفیہ مسجد بھوپال کے محلہ احمد آباد میں واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے مسجد صوفیہ کا فاصلہ تین میل ہے۔ اسٹیشن سے بذریعہ بس آنے والے لوگ اسپتال کے بس اسٹاپ پر اتریں۔ انشاء اللہ گاڑی کا انتظام بھی رہے گا۔

جو لوگ اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اپنے اپنے مقام سے انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی آمد کی اطلاع ناظم اجتماع بھوپال کو روانہ کر دیں تاکہ انتظامات میں آسانی ہو۔ جو لوگ پہلے خط لکھ چکے ہیں وہ بھی ازراہ کرم دوبارہ ذیل کے پتہ پر اطلاعی کارڈ بھیج کر اپنی تعداد سے مطلع فرمائیں۔

اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھنے والے تمام حضرات کی طرف سے پیشگی اطلاع کا ملنا بہت ضروری ہے۔ اطلاع بھیجنے کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر یہ ہے :

ایم۔ وائی۔ فاروقی، آفس سکریٹری الرسالہ اکیڈمی
ہاؤس نمبر ۳۰ احاطہ نور محمد خاں، پیر گیٹ، بھوپال (ایم پی)

M.Y. Farooqi, Office Secretary, Al-Risala Academy
30, Ahata Noor Mohammad Khan, Peer Gate, Bhopal 462001
Phone: (0755) 545956, 545948

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	6/-
عظمت صحابہ	6/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسول	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	95/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیات اسلام	–
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقت اسلام	–
علماء اور دور جدید	–
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرت رسول	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-
ہندی	
سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-
عربی	
الاسلام يتحدى	85/-
الاسلام والعصر الحديث	55/-
آڈیو کیسٹ	
A-1 حقیقت ایمان	25/-
A-2 حقیقت نماز	25/-
A-3 حقیقت روزہ	25/-
A-4 حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقت حج	25/-
A-6 سنت رسول	25/-
A-7 میدان عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحاد ملت	25/-
A-12 تعمیر ملت	25/-
A-13 نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ و تفسیر)	
A-14 متفرق سورتیں ۱	/-
A-15 متفرق سورتیں ۲	/-
A-16 متفرق سورتیں ۳	/-
ویڈیو کیسٹ	
V-1 پیغمبر انقلاب	0/-
V-2 اسلام دائمی امن	00/-
V-3 اسلام دور جدید کا خالق	00/-
V-4 امت مسلمہ اور جدید چیلنج	00/-
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	00
V-6 اسلام اور دور حاضر	00/-
od Arises	75/-
luhammad	75/-
he Prophet of evolution	
slam As It Is	40/-
od Oriented Life	60/-
Vords of the Prophet	–
ntroducing Islam	–
igion and Science	30/-
bligh Movement	20/-
slam the Voice f Human Nature	–
slam the Creator f Modern Age	–
he Way to Find God	5/-
he Teachings of Islam	6/-
he Good Life	6/-
he Garden of Paradise	6/-
he Fire of Hell	6/-
lan Know Thyself!	4/-
luhammad The Ideal Character	5/-
ocial Justice in Islam	–
Vords of Wisdom	–
فائل الرسالہ اردو (مجلد)	
سال 982	80/-
985	80/-
986	80/-
987	80/-
988	80/-
9	80/-
0	80/-
991	80/-
فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)	
984 تا 1991	80/- فی جلد
فائل الرسالہ ہندی (مجلد)	
990-91	85/-

MAKTABA AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi-110 013
Single Copy Rs. 5 □ Annual Subscription Rs 60/$25